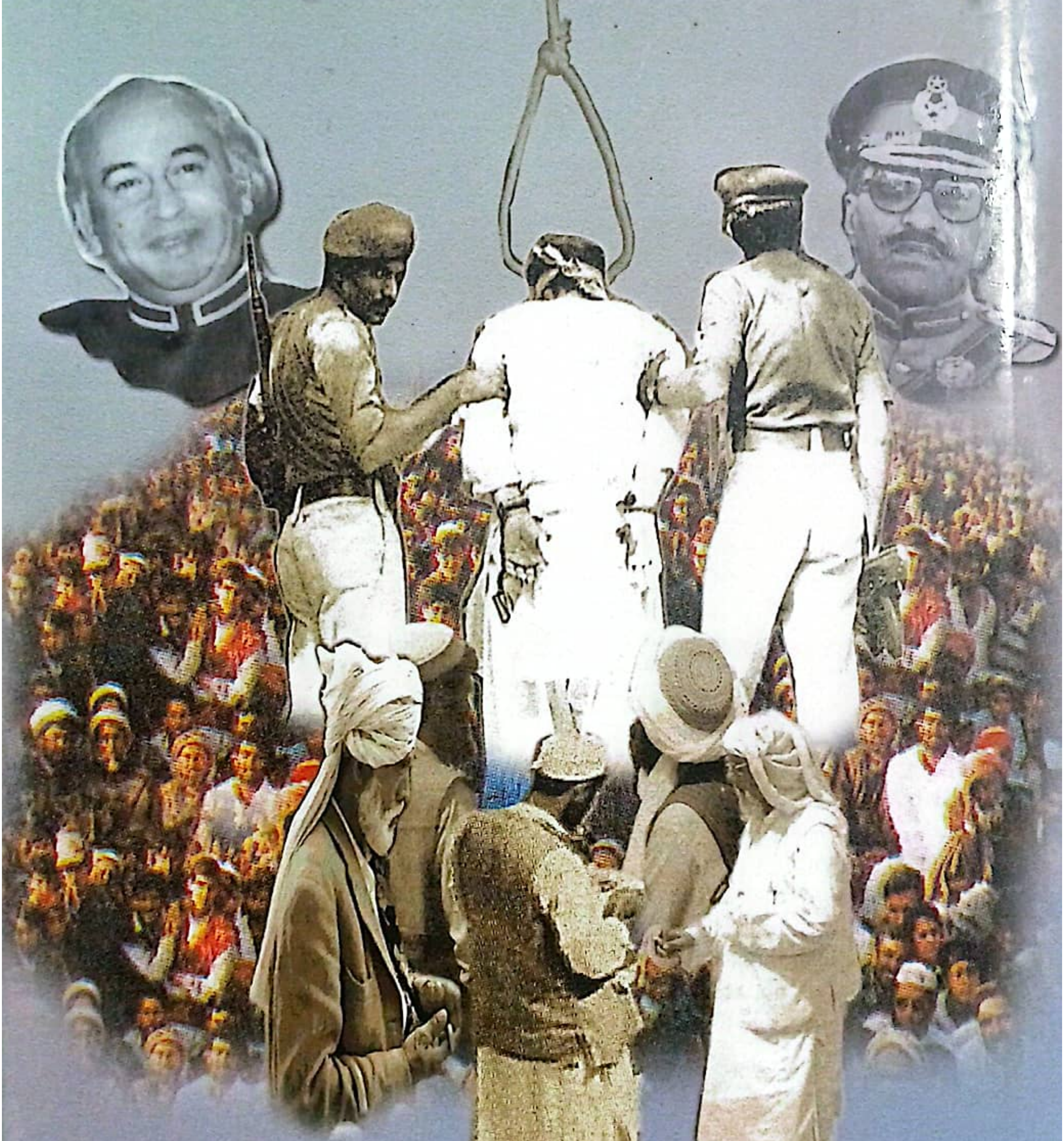
پاکستان کے مذہبی اچھوت



تنویر احمد میر
مرتضیٰ علی شاہ

This book is perhaps the first of its kind to address the issue of Ahmadiyya community of Pakistan in the mainstream dialogue. It is, no doubt, a daring attempt to bring to the forefront, the plight of the Ahmadis who continue to be marginalized and discriminated against, so gruellingly, by law, enacted at the whims of religious fanatics, state politicians and bureaucrats. Throughout the volume of this book, the authors have tried to plead the case of human justice and human dignity. The Ahmadiyya-saga narrates how the well educated, well meaning, galvanizingly enterprising community was unnecessarily relegated to the status of a minority. In doing that, this community lost all basic human rights, socially, economically and politically as in the case of most other minorities living in Pakistan. For example, Ahmadis were suddenly given the shock of being removed from their official positions. The hatred against them led to the burning of their properties and denial of displaying their *Kalmas* at places of worship. The worst being that they have to declare their identity on the passport so that they can discriminatingly be treated as *persona non grata.* This community today has to think hard to declare its identity to avoid differentiation in pursuit of career-building, the rights and privileges that only the majority enjoy.

In all their only crime is to follow a religious sect that the self-professed fanatics denounce, unfortunately in the name of their own religion. In this entire scenario, they have forgotten the human face of it and that all religions were made for humans, giving them a code of ethics, to coexist within the realm of tolerance and peace. Instead, religion today is used as a powerful tool to promote selfish interests for worldly gains. What an irony??

Dr. Jennifer Bennett

پاکستان کے مذہبی اچھوت

تنویر احمد میر
مرتضیٰ علی شاہ

الحسیب پبلشرز
اسلام آباد

جملہ حقوق بحق مصنفین محفوظ

ISBN NO. 969-8427-00-7

اشاعت اول : 1998ء

تعداد : 1000

سرورق : سلیم پاشا

نام کتاب : پاکستان کے مذہبی اچھوت

مصنفین : تنویر احمد میر/ مرتضیٰ علی شاہ

کمپوزنگ : احمد گرافکس، اسلام آباد

ناشر : آصف عبدالقادر

الحبیب پبلشرز،

پوسٹ بکس نمبر 150، اسلام آباد

قیمت : 250 روپے

15 یو ایس ڈالرز

10 پاؤنڈ اسٹرلنگ

انتساب

عاصمہ جہانگیر کے نام!

جو پاکستان کے رجعت پسند معاشرے میں مذہبی، سماجی اور فکر و ضمیر کی آزادی کے لئے برسرپیکار ہیں۔

انسان کے نام!

جو آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن جسے بے رحم سماج نے روایتوں اور توہم پرستی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

پاکستانی اقلیتوں کے نام!

جو پاکستانی غیر منصفانہ معاشرے میں غلامی، تشدد، مذہبی منافرت، استحصال، جبر اور غیر انسانی سلوک کا شکار ہیں۔

فہرست عنوانات

○

جماعت احمدیہ اپنے متعلق کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ احمدیت ہی حقیقی اسلام ہے اور بالاخر اسی کے ذریعے تمام مذاہب عالم ایک جھنڈے تلے جمع ہوں گے اور ساری دنیا حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گی۔

***

جماعت احمدیہ عوام الناس کی جماعت ہے اور یہی خصوصیت اس کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ اگرچہ اس میں اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی کثرت سے شامل ہیں۔ مثلاً پروفیسر عبدالسلام جیسے نوبل انعام یافتہ سائنس دان۔ (حضرت) چوہدری محمد ظفراللہ خان جیسے عالمی عدالت انصاف کے (سابق) چیف جسٹس اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے (سابق) صدر' ایم۔ ایم۔ احمد جیسے عالمی بنک کے ڈائریکٹر اور ماہر اقتصادیات' مختلف ملکوں کے وزراء متعدد جرنیل' دانش ور' ماہرین' صنعت کار' تاجر اور اچھے خاصے کھاتے پیتے مرفہ حال لوگ جماعت میں شامل ہیں۔ لیکن جماعت کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو عوام الناس کہلاتے ہیں۔ یہی لوگ جماعت کا جزوِ اعظم ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت

کے حامل ہیں۔

***

جماعت کے مخالفین جنہوں نے جماعت کو ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور اسے نیست و نابود کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ایک ایک کر کے خود مٹتے چلے گئے۔ بعض تو بڑی ذلت کی موت مرے اور بعض گمنامی کی حالت میں عالم آخرت کو سدھار گئے اور ان کا کوئی نام لیوا تک باقی نہ رہا۔ اس کے برعکس جماعت عہد بعہد ترقی پہ ترقی کی منازل طے کرتی چلی گئی۔

***

(اقتباسات: "ایک مرد خدا"، مصنفہ آئن ایڈم سن 'ترجمہ چوہدری محمد علی ایم۔اے)

دیباچہ

"پاکستان کے مذہبی اچھوت" اس لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے کہ اس میں پاکستان میں بسنے والی احمدی اقلیت کا کیس شاید پہلی بار قوم کے سامنے واضح طور پر رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے لکھی جانے والی کتابوں اور مضامین کا دائرہ کار مخصوص مذہبی یا سیاسی حلقوں کے اندر ہی محدود رہا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک جراتمندانہ قدم ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ سے احمدیوں کی حالت زار کو قوم کے سامنے منظرعام پر لایا گیا ہے جس کی وجہ مذہبی جنونیوں، ریاستی سیاستدانوں، افسر شاہی اور ریاست کے ہاتھوں بننے والے قوانین ہیں اور پاکستان کے احمدی شہری جس کے سبب استحصال زدہ اور انسانیت سوز زندگی گزار رہے ہیں۔ "پاکستان کے مذہبی اچھوت" کے مصنّفین نے دراصل انسانی عظمت اور انسانی مساوات کی بحالی کی آواز بلند کی ہے، احمدیوں کی دکھ بھری داستان اور ان تمام حالات پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے جن کے تحت ایک مہذب، تعلیم یافتہ، وطن دوست اور معاشرے کے باشعور طبقے کو اقلیت قرار دے کر قومی دھارے سے کاٹ دیا گیا۔ اس سارے عمل میں احمدیوں کو پاکستان میں بسنے والی دوسری اقلیتوں کی طرح تمام سماجی، معاشی، سیاسی اور بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ انہیں سرکاری محکموں سے خارج کیا گیا، نفرتوں کی آگ اتنی بھڑکی کہ احمدیوں کی املاک اور جائیدادوں کو بھسم کر گئی اور کلمہ طیبہ آویزاں کرنا بھی "حرام" قرار دے دیا گیا۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ پر بھی احمدیوں کو لازماً اپنی الگ حیثیت ظاہر کرنا پڑتی ہے تاکہ آسانی سے ان کے خلاف

موجود ریاستی امتیاز کو جاری رکھا جا سکے اور ان کے وجود اور شناخت کی سرے سے نفی کی جا سکے۔ لیکن آج احمدی جماعت کو یہ سوچنا ہے کہ وہ ان امتیازات سے بچنے کے لئے اپنی شناخت کا کھل کر اظہار کریں تا کہ اکثریت کی مانند وہ بھی مساوی روزگار زندگی اور بحیثیت شہری حاصل ہونے والے تمام حقوق سے بہرہ مند ہو سکیں۔

احمدیوں کا واحد جرم ان مذہبی نظریات کی تقلید ہے جنہیں ان نام نہاد مذہبی انتہاپسندوں کی تائید حاصل نہیں ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ یہ کٹھ ملا مذہب ہی کے نام پر اقلیت سے جینے کا حق چھین رہے ہیں۔ تنگ نظری کے اس ماحول میں یہ انتہاپسند خود مذہب کے اس عالمگیر انسانی پہلو کو بھول چکے ہیں کہ تمام مذاہب انسانوں کی خاطر بنائے گئے ہیں اور یہ کہ مذاہب ہمیں اخلاقیات' بقائے باہمی' امن اور رواداری کا درس دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہب کو آج دنیاوی مفادات' ذاتی اغراض اور استحصال کا ایک منفعت بخش ذریعہ بنا دیا گیا ہے.... یہ انتہائی افسوسناک صورتحال ہے۔

ڈاکٹر جینیفر بینٹ

پیش لفظ

ہماری یہ مشترکہ کاوش بہت پہلے آ جانی چاہئے تھی لیکن جب بھی ہم نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے اور اسے شائع کرنے کے بارے میں سوچا' دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس ملک کے حالات اور مذہبی و سیاسی فضا اس کتاب کے لئے بالکل مناسب نہیں ہے۔ ملک درجن بھر گروہ بندیوں میں تقسیم ہو چکا ہے کہیں چھوٹے چھوٹے سیاسی گروہ اپنی ذاتی مطلب براری کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کہیں نسلی اور لسانی دنگے ہو رہے ہیں۔ کہیں پر مذہبی فرقے آپس میں دست و گریباں ہیں اور کہیں اکثریت اپنے تشدد کے ذریعے تمام مذہبی اقلیتوں کو مکمل طور پر کچل دینا چاہتی ہے۔ ایسی فضا میں' جب کوئی عقل اور دلیل پر کان دھرنے کے لئے تیار نہ ہو' ایسی کتاب کے لکھنے اور چھاپنے کے بارے میں سوچنا کسی بھی طرح عقلمندی نہیں۔ چنانچہ کئی بار ہم نے اس کام میں ہاتھ ڈالا اور کھینچ لیا لیکن اس سے مکمل طور پر کبھی دستبردار نہ ہو سکے۔

دوسری طرف مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ احمدی اور مسیحی' اکثریت کے جبرو تشدد کا خاص طور پر نشانہ بننے لگے۔ ان کے ساتھ نہ صرف مذہبی تفریق روا رکھی گئی بلکہ انہیں معاشی' سماجی اور سیاسی طور پر بھی استحصال اور بلیک میلنگ کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے کاروبار پر حملے ہوئے' ان کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ انہیں جداگانہ انتخابات کی مار دی گئی اور سیاسی طور پر پورے عوام سے کاٹ دیا گیا۔ یہی نہیں ان پر B-295 اور C-295 کی تعزیرات مسلط کی گئیں تاکہ وہ ہر

وقت جان کے خطرے میں مبتلا رہیں اور اکثریت کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے رہیں۔

ان حالات میں کتنا صبر کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی ہم نے کتاب لکھنے کے پروگرام کو کئی بار آگے بڑھایا لیکن ایک وقت آتا ہے جب صبر کے تمام بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس کتاب کی اشاعت کو مزید ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اس کتاب کا موضوع پاکستان کی تمام اقلیتیں نہیں ہیں بلکہ اس میں صرف احمدیوں کی حالت زار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم نے احمدیت کے قیام سے پاکستان کے قیام تک، پاکستان کے قیام میں احمدیوں کے کردار، 1953ء کی اینٹی قادیانی تحریک، 1974ء میں احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور 1980ء کی دہائی میں ضیاء الحق کے انتہائی احمدی دشمن اقدامات کو تفصیل سے اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے اور واقعات کی ترتیب سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح احمدی کمیونٹی کے خلاف دن بدن تشدد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ذوالفقار علی بھٹو کے جمہوری دور میں اور ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد بینظیر اور نواز شریف کے دونوں ادوار میں احمدیوں کو بدترین امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا گیا۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ احمدیوں کے خلاف تمام تر اشتعال انگیزی کے باوجود سختی سے حقائق کی پیروی کی جائے اور ایسے جذباتی انداز سے 'جو ان حالات میں انتہائی فطری ہوتا ہے' بچنے کی پوری کوشش کی جائے۔ بلکہ ہم نے کئی مقامات پر حقائق کو کھل کر بیان کرنے سے اجتناب کیا ہے کیونکہ احمدیوں کے خلاف ہونے والے تشدد کا ایک ہی جواب ہے کہ عدم تشدد اور برداشت کا مظاہرہ کیا جائے۔

احمدیوں کے خلاف گذشتہ دس برسوں کی کارروائیوں کو اگر بلا تبصرہ مرتب کر کے شائع کر دیا جائے تو اس ملک میں ایسی آگ لگ سکتی ہے جسے سات سمندروں کا پانی بھی نہیں بجھا سکے گا۔ عالمی برادری اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے وقتاً فوقتاً جو حقائق منکشف کئے ہیں اگر ہم وہ سارے حقائق انہی لفظوں میں بیان کر دیں تو خون کی ندیاں بہہ نکلیں لیکن ہم جیو اور جینے دو پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایک مہذب سول سوسائٹی کہلائیں جہاں ہر شخص کو اظہار اور عقیدے کی آزادی ہو۔ عقیدے کے اختلاف پر اس کی جان کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

اس لئے ہم نے چاہا ہے کہ مزید آگ بھڑکانے کی بجائے ان کے شعلے کم کرنے کی کوشش کی

جائے۔ ہماری یہ چھوٹی سی کاوش اگر اس ملک میں مذہبی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو آگے بڑھانے میں کامیاب رہی تو ہم اسے اپنی خوش قسمتی سمجھیں گے۔ ہم نے کتاب کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے اور ہر بات کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھ کر کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب سے نہ تو کسی کی دلازاری مراد ہے اور نہ ہم اپنے عقیدے کو دوسروں پر مسلط کرنے کے حامی ہیں۔ اگر اس کتاب کو اسی باہمی افہام و تفہیم کے جذبے سے پڑھا جائے تو ہم اسے اپنی کامیابی تصور کریں گے۔

اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں ہم اپنے ان تمام دوستوں اور رفقاء کے مشکور ہیں جن کے گراں قدر مشورے، خلوص سے بھرپور تعاون اور بے پایاں ہمدردیاں قدم قدم پر ہمارے لئے حوصلے کا باعث بنیں اور اس طرح حق و صداقت کی منزلوں کی طرف سفر میں ہمارے اندر نئے جذبے پیدا ہوئے۔۔۔ ہم خاص طور پر نظارت اشاعت ربوہ کے جناب اعظم اکسیر صاحب اور لاہور کے جناب شیخ خالد عزیز کے گراں قدر مشوروں اور عملی تعاون پر ان کے بے حد مشکور ہیں۔ ہم معروف سکالر ڈاکٹر جینیفر بینٹ کے بھی بے حد شکرگزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا اور بخوشی اپنے ایک مضمون "پاکستان میں جمہوریت اور مذہبی سیاست" کو بطور خصوصی مقالہ اس کتاب میں شامل کرنے کی اجازت دی اور آخر میں اس کتاب کے ناشر جناب آصف عبدالقادر کے جنہوں نے اس کتاب کو شائع کرنے اور آپ تک پہنچانے کی کٹھن ذمہ داری اٹھائی۔

تنویر احمد میر / مرتضٰی علی شاہ

اسلام آباد،

7 جون 1998ء

باب 1

احمدی قضیہ کی حقیقت

جس نزاع کا نتیجہ فساد کی صورت میں رونما ہوا۔ اس کی ابتدا اس مناقشہ سے ہوئی تھی۔ جس کو سرکاری تحریروں میں "احرار احمدی نزاع" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے یہ مناقشہ تقسیم سے بہت پہلے موجود تھا۔ لیکن ہمارے سامنے تمام غیر احمدی فریقوں نے اس تعبیر کے خلاف اظہار ناراضی کیا۔ اس بنا پر کہ احمدیوں سے اختلافات صرف احرار تک محدود نہیں بلکہ مسلمانوں کے تمام فرقے ان اختلافات پر متحد ہیں۔ اسی طرح غیر احمدیوں نے اس امر کے خلاف بھی برہمی کا اظہار کیا کہ لفظ "احمدی" مخصوص طور پر مرزا غلام احمد کے پیرووں کے لئے استعمال کیا جائے اور تمام مسلمان احمدی ہیں کیونکہ وہ محمد رسول اللہ صلعم کے پیرو ہیں (جن کا دوسرا نام احمدؐ ہے) غیر احمدیوں کا خیال ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیرووں نے یہ لقب زبردستی مسلمانوں سے چھین رکھا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے سواد اعظم کو جو مرزا غلام احمد کو نہیں مانتا ممیز و ممتاز کرنے کے لئے لفظ "مسلمان" استعمال کریں اور احمدیوں کے قادیانی فرقے کیلئے جو مرزا غلام احمد کو نبی مانتا ہے۔ احمدی، قادیانی یا مرزائی کی اصطلاح اختیار کریں۔

قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو عقایدی اور معاشرتی اختلافات ہیں۔ ان کے متعلق ہم حصہ پنجم میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ یہاں ہمیں صرف تحریک احمدیت کی مختصر کیفیت بیان کرنا ہے۔ اس تحریک کی بنیاد مرزا غلام احمد نے رکھی۔ جو سکھ دربار کے ایک جرنیل مرزا غلام مرتضیٰ کے

پوتے تھے۔ مرزا غلام احمد 13 فروری 1835ء کو بمقام قادیان پیدا ہوئے۔ یہ ضلع گورداسپور کا ایک گاؤں ہے جس میں واحد مالک کی حیثیت اسی خاندان کو حاصل تھی۔ مرزا غلام احمد نے فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم گھر پر پائی۔ کسی قسم کی مغربی تعلیم کے حصول کا سراغ نہیں ملتا۔ 1864 میں ان کو عدالت ضلع سیالکوٹ میں ایک نوکری مل گئی۔ جہاں وہ چار سال تک کام کرتے رہے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو از سرتاپا دینیات کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا اور 1880ء اور 1884ء کے درمیان اپنی مشہور کتاب "براہین احمدیہ" چار جلدوں میں لکھی۔ کچھ مدت بعد چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس زمانے میں شدید مذہبی مناقشے اور مناظرے جاری تھے۔ اسلام پر نہ صرف عیسائی مشنری ہی پے در پے حملے کر رہے تھے۔ بلکہ ہندوؤں کی مقبول عام تحریک آریہ سماج کے پرچارک بھی اسی مشغلے میں مصروف تھے۔

مارچ 1882ء میں مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا کہ انہیں الہام ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص مقصد تفویض کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا وہ "مامور من اللہ" ہیں۔ 1888ء میں انہوں نے پھر ایک الہام کی بنا پر اپنے مویدین سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ 1890ء کے اواخر میں مرزا صاحب کو پھر الہام ہوا کہ یسوع ناصری (عیسیٰ ابن مریم) نہ صلیب پر فوت ہوئے۔ نہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ بلکہ جب وہ صلیب پر زخمی ہو گئے تو ان کے شاگردوں نے انہیں اسی مجروح حالت میں صلیب پر سے اتار لیا اور ان کے زخموں کا علاج کیا۔ اس کے بعد وہ کشمیر چلے گئے اور وہیں طبعی موت مر گئے۔ یہ عقیدہ غلط ہے کہ وہ روز قیامت کے قریب اپنے اصلی جسم عنصری کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ ان کے دوبارہ ظہور کے وعدے کا مطلب صرف یہ ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کے صفات و اخلاق رکھنے والا ایک اور شخص امت محمدیہ میں پیدا ہو گا۔ یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے اور مرزا غلام احمد ہی وہ مثیل عیسیٰ اور مسیح موعود واقع ہوئے ہیں۔ اس عقیدے کی اشاعت پر مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ یہ اس عام مسلمہ عقیدے کے منافی تھا کہ عیسیٰ ابن مریم جسم عنصری کے ساتھ آسمان سے اتریں گے۔ چنانچہ علمائے دین نے اس کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے "مہدی معہود" ہونے کا دعویٰ بھی کیا اور اعلان کیا کہ میں ایسا مہدی نہیں جو جنگ و خونریزی میں مصروف ہو جاؤں بلکہ میں مہدی معقول ہوں اور دلائل و براہین کی قوت سے اپنے

مخالفین کو مغلوب کروں گا۔ اس نئے دعوے سے مرزا صاحب کی مخالفت زیادہ بھڑک اٹھی اور علمائے دین ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے لگے۔ 1900ء میں مرزا صاحب نے ایک اور عقیدے کا اظہار کیا کہ آج کے بعد جہاد بالسیف کا قصہ ختم ہے۔ اب جہاد اسی پر موقوف ہے کہ مخالف کو دلیل و برہان سے قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ 1901ء میں مرزا صاحب نے "ظلی نبی" ہونے کا دعویٰ کیا اور "ایک غلطی کا ازالہ" کے عنوان سے ایک اشتہار شائع کیا۔ جس میں بتایا کہ ختم نبوت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم کے انتقال کے بعد کوئی ایسا نبی پیدا نہ ہو گا جو کسی نئی شریعت کا حامل ہے لیکن کسی غیر تشریعی نبی کا ظہور عقیدہ ختم نبوت کے خلاف نہیں ہے۔ نومبر 1904ء میں مرزا صاحب نے سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں "مثیل کرشن" ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔

جماعت احمدیہ 1901ء میں قائم کی گئی اور مرزا صاحب کی استدعا پر اسی سال مردم شماری کے کاغذات میں اس جماعت کو ایک علیحدہ مسلم فرقہ ظاہر کیا گیا۔ جماعت کی موجودہ تعداد پاکستان میں دو لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے اور احمدی دوسرے مسلم ممالک میں اور بھارت، یورپ اور امریکہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اس نئی تحریک کو مرزا صاحب کی زندگی ہی میں خاصی تائید حاصل ہو گئی تھی اور متعدد ممتاز اور ذی اثر لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ جب 1908ء میں مرزا صاحب کا انتقال ہو گیا تو مولوی نور الدین جماعت احمدیہ کے خلیفہ اول مقرر ہوئے۔ 1914ء میں خلیفہ نور الدین کا بھی انتقال ہو گیا اور مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر الدین محمود احمد (موجودہ امام جماعت) خلیفہ ثانی قرار پائے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی مسند نشینی پر جماعت میں پھوٹ پڑ گئی۔ جماعت کا ایک حصہ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی کی سرکردگی میں الگ ہو گیا۔ اور ایک علیحدہ پارٹی "لاہوری پارٹی" کے نام سے وجود میں آ گئی۔ دونوں پارٹیوں میں فرق یہ ہے کہ قادیانی پارٹی کے عقیدے میں مرزا غلام احمد نبی ہیں۔ لیکن لاہوری پارٹی مرزا صاحب کو یہ درجہ دینے پر آمادہ نہیں۔ اس کے نزدیک مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ ایک مجدد یا محدث ہیں۔ ان الگ ہونے والوں نے لاہور میں اپنی ایک تنظیم قائم کر لی۔

(حوالہ: جسٹس منیر احمد عدالتی تحقیقاتی رپورٹ فسادات پنجاب 1953ء)

باب 2

تحریک پاکستان اور احمدیت

انیسویں صدی کے دوسرے نصف کی ابتداء ہوتے ہی برصغیر میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے پر شکوہ اقتدار کا سورج غروب ہوگیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا رسمی اقتدار بھی 1857ء کی جنگ آزادی کے نتیجہ میں ختم ہوا اور اس خطے کے مسلمانوں پر ہندوؤں اور انگریزوں کے مظالم کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس نے تاریخ کے اوراق کو بھی شرم سے آنکھیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔ ایک طرف مسلمان اپنے اقتدار کے خاتمہ پر دل گرفتہ تھے اور دوسری طرف انگریز فاتح مسلمانوں کو مفتوح بنا کر ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے نتیجتاً اس خطہ میں جہاں 712ء میں مسلمان نعرۂ حق بلند کرتے ہوئے وارد ہوئے اور پھر صدیوں حکمران رہے اب حالات یوں تھے کہ پورے ہندوستان کے مسلمان قیادت سے محروم ہو کر رہ گئے تھے۔

1857ء کے بعد کئی سالوں تک اس حریت پسند خطہ میں آزادی کا لفظ جیسے کبھی کسی زبان کی لغت کا حصہ نہ تھا اور انیسویں صدی کے آخر تک تو اس لفظ کا ذکر بھی گناہ کبیرہ ٹھہرا۔

انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار ہندوستانی غلاموں کیلئے انگریز شاہی کے ایوانوں میں ایک آواز گونجتی سنائی دی۔ یہ کسی انقلابی سیاسی رہنما یا تحریک پاکستان کے رائج الوقت سکوں (جن کی آج حکومتی سطح پر پوجا پاٹ کی جاتی ہے) کی نہیں تھی بلکہ یہ شخصیت حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی تھی۔ آپ نے اپنی کتاب آئینہ کمالات اسلام میں (جو کہ 1893ء میں چھپی) لکھا ہے۔

"اے قیصرہ میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو آپ کی مملکت میں ایک خصوصیت حاصل ہے اس لئے آپ کو چاہئے کہ مسلمانوں پر خاص نظر عنایت رکھیں اور ان کی

آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائیں اور ان کی تالیف قلب کریں اور اپنے اکثر مقرب اور وزراء انہی میں سے بنائیں۔

نیز فرمایا:

"کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا ملک دیا ہے جہاں وہ ایک ہزار سال تک حکومت کر چکے ہیں اور انہیں اس ملک میں ایک خاص شان حاصل تھی اور وہ ہندوؤں پر حاکم رہے ہیں۔ پس آپ کے لئے بھی مناسب ہے کہ آپ ان سے عزت کا معاملہ کریں اور بڑے بڑے مناصب اور عہدے ان کے سپرد کریں۔" (آئینہ کمالات اسلام' خلاصہ' صفحہ 535 تا 540)

تحریک پاکستان کا بنیادی خیال یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا دو علیحدہ علیحدہ ملتیں ہونا اور پھر تحریک پاکستان عملاً شروع ہونے کا ابتدائی مرحلہ یعنی سیلف گورنمنٹ یا حکومت خود اختیاری کا طریق ہر دو نظریات کا ابتدائی بیان ہمیں حضرت اقدس کے ملفوظات و کتب میں مل جاتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ تحریک پاکستان کی بنیادی اینٹ حضرت اقدس نے رکھی۔ مگر پاکستان کے مورخوں اور حکومت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ تحریک پاکستان کی تاریخ میں حضرت بانی جماعت احمدیہ کی ان کاوشوں کا ذکر یا تو ملتا ہی نہیں اور اگر کوئی لکھاری ان حقائق کا ذکر کرتا بھی ہے تو ایسے جیسے تحریک پاکستان کے کسی کارکن کی خدمات بیان کر رہا ہو اور اس پر بھی کئی قسم کے قدغن لگائے جاتے ہیں۔ حقائق کو مسخ کرنے کیلئے حکومتی مشینری سے لے کر مساجد کے سپیکروں تک کو استعمال میں لا کر عوام کو احمدیوں کے ملک دشمن ہونے کا یقین دلانے کی کوششیں کی جاتی ہیں مگر تاریخی سچائیوں کو کبھی بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

تحریک پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کا باضابطہ آئینی مرحلہ 1917ء میں شروع ہوتا ہے جبکہ برطانوی حکومت کے وزیر ہند نے جو کہ عملاً ہندوستان کا حاکم شمار ہوتا تھا 20 اگست 1917ء کو یہ اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کو صرف حکومت میں شریک کرنا ہی برطانیہ کا منشاء نہیں بلکہ منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ حکومتی خود اختیاری کے قابل ہو جائیں اور رفتہ رفتہ ملک کا پورا نظام ان کے سپرد کر دیا جائے۔

وزیر ہند مسٹر مانٹیگو کے اعلان سے ہندوستان کی سیاست میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی اور ہندو

حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریز نے ہم سے ہی معاملہ طے کرنا ہے اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے والا اور کوئی نہیں۔ مسلم لیگ تو ہماری طفیلی جماعت بن کر رہ گئی ہے۔ حضرت مصلح موعود حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے نومبر 1917ء کو دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب نے جماعت احمدیہ کے وفد کی طرف سے مسٹر مانٹیگو کو ایڈریس پیش کیا اور آئندہ سیلف گورنمنٹ کے طریق انتقال سے متعلق مشورہ دیا اس میں مندرجہ ذیل نکات شامل تھے:

اول: انتخاب کا کوئی ایسا طریق نہ رکھا جائے جس میں قلیل التعداد جماعتیں نقصان میں رہیں۔

دوم: حقوق و فرائض کے تمام معاملات میں یورپین اور غیر یورپین کی تقسیم کو کلیتہ" ختم کر دیا جائے۔

سوم: اندرونی مذہبی اختلافات سے قطع نظر حکومت برطانیہ کو سمجھ لینا چاہئے کہ جماعت احمدیہ کا سیاسی مفاد کلیتہ" ایسے تمام فرقوں کے ساتھ وابستہ ہے جو جماعت احمدیہ کی طرح دعویٰ اسلام رکھتے ہیں۔

مسٹر مانٹیگو کی ہندوستان آمد اور جماعت احمدیہ کے رہنماؤں کے وفد جس کی قیادت سر ظفراللہ خان کر رہے تھے' کی تجاویز نے برصغیر میں اس تاریخی جدوجہد کی ابتداء کی جو بالاخر 1947ء میں پاکستان کی بنیاد ثابت ہوئی۔ اس ساری تحریک کے دوران جماعت احمدیہ نے ہر مرحلہ پر پاکستان کے قیام کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ مسلمانوں کی ہر تحریک کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کیلئے دامے درمے سخنے ہر قسم کی مدد کی اور مسلمانانِ ہند کو سیاسی آزادی سے ہمکنار کرنے کے لئے تاریخی خدمات انجام دیں۔ مسلم لیگ کی بے پناہ امداد کی اور خاص طور پر سیدنا حضرت مصلح موعود نے اپنی خداداد ذہانت اور کمال سیاسی فراست سے کام لے کر ہر مرحلہ پر مسلمانان ہند کی بھرپور راہنمائی فرمائی۔

مسٹر مانٹیگو کی ہندوستان آمد کے بعد تحریک آزادی کے دوسرے اہم مواقع پر حضرت مصلح موعود نے ملت اسلامیہ کی سیاسی طور پر راہنمائی جاری رکھی۔ 1919ء میں جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے نتیجہ میں ہندوستان میں ہنگاموں کا ایک دور شروع ہو گیا اور ہندوؤں نے گاندھی کی قیادت میں

مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے تحریک خلافت شروع کی اور مسلمان اپنی سادہ لوحی میں ان کے دام میں پھنس گئے حضرت مصلح موعود نے ایسے اہم مواقع پر عوام کالانعام کی رائے کے خلاف مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیم سے متعارف کرایا کہ اسلام ایسے کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ تحریک ہجرت کے متعلق لکھا۔

اول۔ تو شرعاً یہ موقع ہجرت کا ہے نہیں۔

دوم۔ اگر خلاف شریعت ہجرت کی بھی گئی تو اس کے سامان چونکہ آپ کے پاس نہیں ہیں اس لئے نقصان ہو گا اور دشمنوں کو ہنسی کا موقع ملے گا پھر افغانستان میں گنجائش بھی نہیں۔" (معاہدہ ترکیہ ملخص صفحہ 10،11)

چنانچہ بعد کے حالات نے حضرت مصلح موعود کی بات کو سچا ثابت کیا۔ ہزاروں مسلمان اپنا گھر بار ہندوؤں کے ہاتھوں اونے پونے داموں فروخت کر کے افغانستان گئے۔ مگر افغانستان کے دروازے بند پا کر خستہ حالی کا شکار ہو گئے تحریک عدم تعاون کے نتیجہ میں ہزاروں مسلم طلباء تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہو گئے اور انہوں نے اپنی ملازمتیں چھوڑ دیں۔ ہندو اس بہانے ہندوستان کے مسلمانوں کو کمزور کرنا چاہتا تھا اور اسے اس معاملے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

حضرت امام جماعت احمدیہ نے 1937ء میں محترم مولانا عبدالرحیم صاحب درد امام مسجد لنڈن کو ہدایت فرمائی تھی کہ چونکہ برٹش پارلیمنٹ کے بہت کم لوگ ہندوستان کی موجودہ حالت کے متعلق مسلمانوں کے نقطہ خیال سے واقف ہیں اور عموماً مسلمانان ہند کے متعلق ایسا تغافل برتا جا رہا ہے اور پارلیمنٹ کے وہ ممبر جو سیاحت ہند کے لئے آتے ہیں ان کو ایسی فضا میں رکھا جاتا ہے کہ جہاں ان کو مسلمانوں سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اس وجہ سے وہ مسلمانوں کے مفاد کے متعلق کچھ بھی علم حاصل کئے بغیر واپس چلے جاتے ہیں اس لئے ان حالات کے پیش نظر لنڈن میں ایک ایسی پولٹیکل لیگ بنائی جائے جس میں ممبران پارلیمنٹ اور دیگر ایسے صاحب اقتدار لوگ شامل ہوں جو ہندوستانی معاملات سے دلچسپی رکھتے ہوں اور جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق پارلیمنٹ اور برٹش پبلک کی ہمدردی حاصل کر سکے اور جس طرح نیشنل کانگرس کی دعوت پر وقتاً فوقتاً ممبران پارلیمنٹ ہندوستان آتے ہیں اسی طرح کوشش کرنی چاہئے کہ مناسب اور موزوں

ممبران پارلیمنٹ مسلمانوں کی دعوت پر ہندوستان آئیں اور ان کا دورۂ ہندوستان کا پروگرام اس طرح مرتب کیا جائے کہ انہیں مسلمان لیڈروں کے ساتھ میل جول کا پورا پورا موقع مل سکے جو مفاد اسلام کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچا سکیں۔(بحوالہ الفضل 30 اگست 1927ء)

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور گول میز کانفرنس

جب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو مولانا غلام رسول صاحب مہر بھی آپ کے ہمراہ گئے۔ پھر دونوں مسجد احمدیہ لندن کی ایک تقریب میں بھی شامل ہوئے اور وہاں امام مسجد لندن مولانا فرزند علی خانصاحب سے ملاقات ہوئی اور ان کی گول میز کانفرنس میں مسلم نمائندوں کے ساتھ تعاون اور مسلم حقوق کے سلسلہ میں ممبران پارلیمنٹ کی ملاقاتوں کا ذکر ہوا تو مولانا غلام رسول صاحب مہر نے امام صاحب کی سیاسی خدمات سے متاثر ہو کر ہندوستان ایک خط لکھا جو اخبار انقلاب میں شائع ہوا۔ جناب مہر صاحب کا خط ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

''مولانا فرزند علی نہایت خوش اخلاق اور نیک طبع بزرگ ہیں، فرائض امامت و تبلیغ کی بجا آوری کے علاوہ مسلمانوں کے جماعتی سیاسی کاموں میں بھی کافی وقت صرف کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے یہاں کے اونچے طبقے میں بہت گہرا اثر رسوخ پیدا کر لیا ہے۔'' (انقلاب، 19 اکتوبر 1931ء)

علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال ہمیشہ بانی احمدیت حضرت مسیح موعود کے معتقد رہے۔ انہوں نے ستمبر 1900ء میں رسالہ انڈین اینٹی کویری میں مرزا غلام احمد قادیانی کو ہندی مسلمانوں میں سب سے بڑا دینی مفکر قرار دیا۔ جبکہ مولانا غلام محی الدین کے بیان کے مطابق خود ڈاکٹر سر محمد اقبال نے 1897ء میں حضرت مسیح موعود کی بیعت کر لی تھی۔(بحوالہ نوائے وقت 15 نومبر 1953ء)

چوہدری ظفر اللہ پہلے مسلمان تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل انگریزوں کو سمجھانے گئے۔ آپ 1937ء میں مسلمانان پنجاب کے نمائندہ کی حیثیت سے لندن تشریف لے گئے۔ آپ نے دارالعلوم اور دارالامراء کے ممبران اور ہندوستان کے معاملات طے کرنے کے لئے برطانوی دفتر انڈیا آفس کے عہدیداروں سابق وائسرائے، گورنروں، پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقاتیں کیں۔ پریس

کانفرنسوں سے خطاب کیا اور مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق کے لئے آواز برطانوی عوام اور سیاستدانوں کے کانوں تک پہنچائی اور مشہور اخبارات مارننگ ٹائمز مانچسٹر' گارڈین' ڈیلی کرانیکل' سنڈے ٹائمز وغیرہ میں ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کے حقوق کے سلسلہ میں مضامین لکھے جس کے نتیجہ میں برطانوی عوام کو مسلمانوں کے حقوق سے واقفیت ہوئی۔ چوہدری ظفراللہ کی لندن میں مصروفیات اور قومی وملی خدمات پر "دور جدید" روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے۔

"پنجاب کونسل کے تمام مسلمانوں نے جو (یقیناً مسلمانان پنجاب کے نمائندے کہلانے کا جائز حق رکھتے ہیں) جبکہ یہ ضرورت محسوس کی کہ پنجاب کی طرف سے ایک مستند نمائندہ انگلستان بھیجا جانا چاہئے تو چوہدری ظفراللہ خان ہی کی ذات ستودہ صفات تھی جس پر ان کی نظر انتخاب پڑی۔ چنانچہ وہ اپنا روپیہ صرف کر کے اور اپنے قیمتی وقت اور آمدنی کو نظرانداز کر کے انگلستان تشریف لے گئے اور اس خوبی اور عمدگی سے حکومت برطانیہ اور سیاسین انگلستان کے روبرو یہ مسائل پیش کئے جس کے مداح نہ صرف مسلمانان پنجاب ہوئے بلکہ حکومت بھی کافی حد تک متاثر ہوئی۔ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے کم از کم تاریخ کی دنیا کا کوئی شخص کسی وقت بھی انکار نہیں کر سکتا۔" (اخبار دور جدید 'لاہور' 16 اکتوبر 1943ء)

حضرت مصلح موعود نے اس دورہ کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

"ہندو اس امر کو سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کا مستقبل انگریز قوم سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے لیڈر برابر آٹھ سال سے گرمیوں میں انگلستان جاتے ہیں اور بڑے بڑے انگریزوں سے ہندوؤں کے فائدہ کی باتیں کر کر کے انہیں اپنا ہم خیال بنا چکے ہیں..... مگر مسلمانوں کے پاس نہ دولت ہے نہ ان کے اندر قربانی کا مادہ' چنانچہ وہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں بالکل سوتے رہے ہیں اور صرف اس سال عزیزم چوہدری ظفراللہ خان صاحب احمدی بیرسٹر لاہور ممبر پنجاب کونسل.... اس غرض سے ولایت گئے تھے اور انہیں کئی بڑے بڑے آدمیوں نے کہا کہ ہمیں تو آج ہی معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی جداگانہ حفاظت کی ضرورت ہے ورنہ ہم تو یہ خیال کرتے تھے کہ ہندو لیڈر جو باتیں کہتے ہیں مسلمان ان سے متفق ہیں۔" (رسالہ مسلمانان ہند کے امتحان کا وقت' صفحہ 13' 14' بحوالہ تاریخ احمدیت' جلد پنجم' صفحہ 625)

سائمن کمیشن اور جماعت احمدیہ کی تجاویز

ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کیلئے برطانوی حکومت نے 8 نومبر 1927ء کو ایک کمیشن مقرر کیا جس کا مقصد اہل ہند کے مطالبات کی تحقیقات کرنا تھا تاکہ کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر ہندوستان میں نئی اصلاحات نافذ کی جاسکیں چونکہ اس کمیشن کے ساتوں ممبر انگریز تھے اور انہیں ہندوستان کے مسائل اور خصوصاً مسلمانوں کے مسائل کے پس منظر سے آگاہی نہ تھی اور نہ ہی وہ اس حوالے سے کوئی ہمدردانہ نقطہ نظر رکھتے تھے اس لئے کانگرس اور مسلم لیگ نے اس کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جماعت احمدیہ کے امام مرزا بشیرالدین محمود احمد نے ''مسلمانان ہند کے امتحان کا وقت'' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی رہنمائی کیلئے تجاویز پیش کی گئی تھیں۔

1۔ انگریزوں کے نزدیک اقلیتوں کی حفاظت کی خاص اہمیت نہیں کیونکہ برطانیہ میں پارٹیوں کی بنیاد سیاسی خیالات پر ہوتی ہے۔ مگر ہندوستان کی پارٹیوں کی بنیاد مذہب ہے اس لئے اقلیتوں کی حفاظت پر زور دینا چاہیے۔

2۔ دوسری اقلیتوں کو بھی کمیشن کے سامنے اپنے حقوق اور مطالبات پیش کرنے میں مدد دیں تاکہ ہندوؤں کی اجارہ داری ختم ہو۔

3۔ جداگانہ انتخاب کو ہندوستان کے اساسی قانون میں درج کیا جائے۔

4۔ پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں مسلمانوں کو اس قدر حقوق دیئے جائیں کہ ان کی کثرت قلت میں نہ بدل جائے۔

5۔ صوبہ سرحد کو باقاعدہ صوبہ بنادیا جائے اور سندھ کو بمبئی سے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

6۔ مذہبی آزادی دی جائے۔

7۔ زبان کسی قوم کی ترقی کا اہم ذریعہ ہوتی ہے اس لئے مسلمانوں کو اردو زبان حاصل کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔

اس کتابچہ کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا اور وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو تقسیم

کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی اکثریت اس بات پر قائل ہو گئی کہ سائمن کمیشن سے تعاون کرنا چاہئے۔ کیونکہ موتی لال' سائمن اور نہرو کئی ماہ اکٹھے رہ چکے ہیں اور وہ ہندوؤں کے نقطہ نظر سے بخوبی آگاہ ہیں اور مسلمانوں کے عدم تعاون سے ان کے اپنے مفادات اور حقوق پر زد پڑ سکتی تھی۔

حضرت امام جماعت احمدیہ نے کمیشن کے لئے احمدیہ وفد تیار کیا جو مسلمانان ہند کے حقوق کے لئے کمیشن کو تجاویز پیش کرے۔ احمدیہ وفد ایک مرتبہ گورداسپور میں کمیشن کے سامنے پیش ہوا اور دوسری بار لاہور میں پیش ہوا۔ اس وفد میں پنجاب کے مختلف حصوں سے سولہ نمائندے شامل ہوئے۔ جماعت احمدیہ کے کمیشن کے سامنے پیش ہونے پر مسلم لیگ کے سر شفیع گروپ نے بھی کمیشن سے تعاون کرنے کا ارادہ کر لیا۔ تحریک پاکستان کے ایک نامور مورخ فاروق اختر نجیب لکھتے ہیں:

"اگرچہ شفیع لیگ نے اس بارے میں اپنے موقف کی وضاحت نہیں کی مگر جناح گروپ کے نواب اسماعیل نے شفیع لیگ کے موقف کی حمایت میں بڑی مضبوط دلیل پیش کی ہے ان کا کہنا تھا کہ کانگرس کا مطالبہ بڑا سیدھا سادہ ہے اور اسے ساری دنیا سمجھتی ہے کہ تمام حکومتی اختیارات عام جمہوری طریقوں کے مطابق عوام کے منتخبہ نمائندوں کے حوالے کر دیئے جائیں اس مطالبے کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنا ہے۔ لیکن مسلمانوں کا مقصد صرف آزادی نہیں بلکہ اس کی ایک خاص شکل ہے اور وہ جب تک اپنے مطالبات کی وضاحت نہ کریں دوسرے کو قائل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا مسلمانوں کے مقصد کی ترجمانی بائیکاٹ کی زبان سے نہیں کی جا سکتی بلکہ اس سے یہ غلط تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان اس مقصد پر متفق ہے جس کے لئے کانگرس لڑ رہی ہے اور مسلمانوں کے مطالبات غیر اہم اور فروعی چیزیں ہیں چنانچہ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ شفیع لیگ کا موقف واقعی درست تھا۔"

(تحریک آزادی' صفحہ 173'174)

حکومت نے ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے ہر صوبے سے ایک صوبائی کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا صوبہ پنجاب کی پنجاب کونسل کی طرف سے سات ارکان پر مشتمل صوبائی کمیٹی قائم کی گئی جس کے رکن چوہدری ظفراللہ خان بھی تھے۔ انہوں نے مسلمانان ہند کے مطالبات نہایت قابلیت کے ساتھ کمیشن کے سامنے پیش کئے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے لاہور کے انگریزی اخبار "سول اینڈ

ملٹری گزٹ" نے لکھا:

"شہادت دینے والوں پر جرح کرنے کے باب میں ایک نمایاں شخصیت چوہدری ظفراللہ خان کی ہے آپ داڑھی رکھے ہوئے ہیں آپ کوئی دور از کار بات نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ مطلب کی بات کہتے ہیں اور اس لحاظ سے آپ سر آتھر فروم سے مشابہ ہیں یعنی آپ کی آواز نہایت پر شوکت ہے اور نہایت برجستہ تقریر کرنے والے ہیں۔" (اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ' 5 نومبر 1928ء)

جداگانہ انتخابات کا مطالبہ

تحریک پاکستان کا ایک اہم اور فیصلہ کن مرحلہ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ تھا۔ 1927ء تک خود مسلم لیگ اور قائداعظم مخلوط انتخابات کے حامی تھے۔ مگر حضرت مسیح موعود کی دوربین نگاہ بہت پہلے ہی اس مسئلہ کو بھانپ چکی تھی کہ جب تک مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخابات ہندوؤں کے ساتھ مشترک رہیں گے کوئی بھی ہندو کبھی کسی مسلمان امیدوار کو ووٹ نہیں دے گا اور یوں مسلمانان ہند اسمبلیوں میں نمائندگی کے حق سے محروم ہی رہیں گے۔

امام جماعت احمدیہ کی ہدایت پر سر چوہدری ظفراللہ خاں نے سائمن کمیشن کے سامنے بھی اسی بات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے اسمبلیوں میں علیحدہ سے نشستیں مخصوص کی جائیں اور انتخابات مخلوط طریقہ کی بجائے جداگانہ ہوں۔ حالانکہ مسلمانوں کے بعض جید سیاسی رہنماؤں (قائداعظم سمیت) نے مخلوط انتخابات کو تسلیم کر لیا تھا۔ جماعت احمدیہ کے جداگانہ انتخابات کی مضبوط دلیلوں کے نتیجہ میں ستمبر 1927ء میں مسلم لیگ نے شملہ میں ہندوستان کی مختلف مسلم جماعتوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں حضرت مصلح موعود کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے پوری کوشش کی کہ تمام مسلم جماعتوں کے نمائندے مخلوط طریقہ انتخابات کی تائید کریں مگر امام جماعت احمدیہ نے اجلاس میں ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ اجلاس کے حاضرین نے جداگانہ انتخابات کے حق میں فیصلہ دے دیا مگر تحریک پاکستان کی تاریخ میں ٹوٹے قلم سے اس حقیقت کو رقم نہیں کیا جاتا اور جداگانہ انتخابات کے اس مطالبے کو قائداعظم کے کھاتے میں چونے سے رنگے گئے بچ کے ساتھ ڈال دیا جاتا ہے جو کہ خود مخلوط طریق انتخاب کے حامی تھے۔

مسلمانوں کے حقوق اور نہرو رپورٹ

کانگرس کے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے نتیجہ میں انگریز حکومت کے وزیر ہند مسٹر برکن ہیڈ نے بیان دیا کہ ”ہندوستانی آپس میں اس حد تک خلفشار اور تعصبات کا شکار ہیں کہ وہ کسی بھی متحدہ دستور پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ کمیشن کا بائیکاٹ کرتے ہیں تو خود ہندوستان کیلئے مناسب دستور کا خاکہ بنا کر دکھائیں۔“

کانگریس نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے 12 فروری 1928ء کو آل پارٹیز کانفرنس طلب کی جس میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کو دستور کی تیاری کا کام تفویض کیا گیا۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی بعد میں وہ ”نہرو رپورٹ“ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس دستور کمیٹی میں مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی نے مسلمانوں کی نمائندگی کی۔

12 دسمبر 1928ء میں دوبارہ آل پارٹیز کانفرنس طلب کر کے اس رپورٹ کی حتمی توثیق کر دی گئی۔ جبکہ اس کانفرنس میں قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کے وفد نے بھی شرکت کی۔

اس کانفرنس میں مولانا محمد علی جوہر جو کہ کانگرس کے سابقہ صدر کی حیثیت سے شریک تھے، کی توہین کی گئی اور قائداعظم کی ترمیمی تجاویز کو سختی سے مسترد کر دیا گیا جبکہ ہندو لیڈر جے کار نے تو یہ تک کہہ دیا کہ ”جناح ضدی بچے کی طرح ہیں جس کا دماغ کانگرس کے لاڈ پیار نے خراب کر دیا ہے۔“

اس رپورٹ کی منظوری کے بعد حکومت کو نوٹس دیا گیا کہ 31 دسمبر 1929ء تک اگر اس رپورٹ کو منظور نہ کیا گیا تو سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔

حضرت مصلح موعود کی دوربین نظریں فوراً اس رپورٹ کے نتائج اور عواقب کو بھانپ گئیں۔ چنانچہ انہوں نے اس رپورٹ پر تبصرہ لکھا اس کے نمایاں سات نکات درج ذیل ہیں:

1- حکومت کا طریق فیڈرل یا وفاقی ہو۔

2- جن صوبوں میں کسی قوم کی اقلیت کمزور ہو اسے اپنے حق سے زیادہ ممبریاں دی جائیں۔

3- کم از کم پنجاب اور بنگال میں جداگانہ طریق انتخاب جاری رہے۔

4- صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے برابر حقوق دیئے جائیں اور سندھ کو الگ بنایا جائے۔

5- کسی صوبہ میں بھی اکثریت کو اقلیت کی زبان یا اس کی طرز تحریر میں مداخلت کا حق حاصل نہ ہو۔

6- حکومت مذہب یا مذہب کی تبلیغ میں دخل دینے کی مجاز نہ ہو۔

7- ان حقوق کو دستور اساسی میں داخل کیا جائے اور دستور اساسی کو اس وقت تک نہ بدلا جاسکے جب تک منتخب شدہ ممبروں میں سے 2/3 اس کے بدلنے کی رائے نہ دیں۔

چونکہ نہرو رپورٹ شائع ہو کر انگلستان اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچ چکی تھی۔ اس لئے امام جماعت احمدیہ نے "مسلمانوں کے حقوق اور نہرو رپورٹ" کتاب تحریر فرمائی۔ جس میں مسلمانوں کے مطالبات کا ناقابل تردید دلائل کے ساتھ معقول ہونا ثابت کیا اور نہرو رپورٹ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن کی انگلستان میں وسیع اشاعت کی گئی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی ہال میں ایک پورا ہفتہ India Today کے موضوع پر تقریریں کی گئیں جس میں جماعت احمدیہ کے مبلغ امام مسجد لنڈن مولانا جلال الدین صاحب شمس نے بھی مقالہ پڑھا صدر جلسہ مسٹر فلپس نے اپنے صدارتی ریمارکس میں کہا کہ "ہم نے جس قدر تقریریں سنی ہیں ان سب میں سے یہ تقریر زیادہ ٹھوس اور جامع ہے۔" سر ہنری نے جو گورنمنٹ کے معزز عہدہ پر فائز تھے کہا "یہ وجوہات نہایت ہی مفید ہیں اور یہ ہر جگہ کی اقلیتوں کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔" اس طرح سے مسلمانوں کے خلاف اثر کو زائل کرنے کی کامیاب کوششیں کی گئیں اور پنڈت نہرو ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کی کوشش میں بری طرح ناکام ہو گئے۔

ہندوؤں کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تسلیم نہ ہونے پائے۔ جماعت احمدیہ مسلمانوں کے اس مطالبے کو منظور کرانے میں ہمیشہ پیش پیش رہی چنانچہ حضرت امام جماعت احمدیہ نے ان مسلمانوں کو جو ہندوؤں کے زیر اثر مخلوط انتخاب کے حامی تھے مخاطب کرتے ہوئے نہرو رپورٹ پر اپنے تبصرے میں بروقت انتباہ کیا کہ

"میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشش نہ کرو۔ جبکہ انگلستان نے فیصلہ کر دیا

ہے کہ ہندوستان کو نیابتی حکومت کا حق ہے اس کے لئے جو جائز کوشش کی جائے اس میں اپنے دوسرے بھائیوں کے شریک ہوں مگر جو چیز مجھ پر گراں ہے اور میرے دل کو بٹھائے دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان---- اپنے حقوق کی حفاظت کئے بغیر آئندہ طریق حکومت پر راضی ہو جائیں اس کے نتائج نہایت تلخ اور نہایت خطرناک نکلیں گے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ جب تک کہ دونوں مسلم لیگیوں کی پیش کردہ تجاویز کو قبول نہ کرلیا جائے اس وقت تک وہ کسی صورت میں بھی سمجھوتے پر راضی نہ ہوں ورنہ جو خطرناک صورت پیدا ہوگی اس کا تصور کر کے بھی دل کانپتا ہے۔" (مسلمانوں کے حقوق اور نہرو رپورٹ، صفحہ 36)

امام جماعت احمدیہ کی آل پارٹیز کانفرنس شملہ میں تقریر اور آپ کے لیکچروں سے جو آپ نے مسلمانوں کی راہنمائی اور ان کی تنظیم اور ان کے حقوق کے لئے دیئے مسلمانوں کے نامور لیڈر مولانا محمد علی صاحب جوہر بہت متاثر ہوئے چنانچہ انہوں نے حضور کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اخبار میں لکھا:

"ناشکری ہوگی کہ جناب مرزا بشیر الدین محمود احمد اور ان کی اس منظم جماعت کا ذکر ان سطور میں نہ کریں جنہوں نے اپنی تمام تر توجہات بلا اختلاف عقیدہ تمام مسلمانوں کی بہبودی کے لئے وقف کردی ہیں۔ یہ حضرات اس وقت اگر ایک جانب مسلمانوں کی سیاست میں دلچسپی لے رہے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی تنظیم تبلیغ و تجارت میں بھی انتہائی جدوجہد سے منہمک ہیں اور وہ وقت دور نہیں جبکہ اسلام کے لئے بالعموم اور ان اشخاص کے لئے بالخصوص جو بسم اللہ کے گنبدوں میں یہ بیٹھ کر خدمت اسلام کے بلند بانگ و درباطن ہیچ دعاوی کے خوگر ہیں مشعل راہ ثابت ہوگا۔ جن جن اصحاب کو جماعت احمدیہ کے اس جلسہ عام میں جس میں مرزا صاحب موصوف نے اپنے عزائم اور طریق کار پر اظہار خیالات فرمایا ہے شرکت کا شرف حاصل ہوا ہے وہ ہمارے خیال کی تائید کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔" (ہمدرد، دہلی، 26 ستمبر 1937ء)

اسی طرح اخبار مشرق گورکھپور نے لکھا:

"اس وقت ہندوستان میں جتنے فرقے مسلمانوں کے ہیں سب کسی نہ کسی وجہ سے انگریزوں یا ہندوؤں یا دوسری قوموں سے مرعوب ہو رہے ہیں صرف ایک احمدی جماعت ہے جو قرون اولیٰ کے

مسلمانوں کی طرح کسی فرد یا جمعیت سے مرعوب نہیں ہے اور خاص اسلام کا کام سرانجام دے رہی ہے۔" (مشرق 22 ستمبر 1927ء)

گول میز کانفرنس

نومبر 1930ء میں گول میز کانفرنس ہونا قرار پائی تو حکومت نے اعلان کیا کہ کانفرنس میں کوئی خاص سکیم غور کیلئے معین نہیں کی جائے گی۔ مگر امام جماعت احمدیہ نے اپنی روحانی اور سیاسی بصیرت سے آنے والے حالات کو بھانپتے ہوئے مسلمانان ہند کی رہنمائی کیلئے "ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسئلہ کا حل" کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کی اردو اور انگریزی زبانوں میں اشاعت کا اہتمام ہوا۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ

"تبصرہ کے چند مقامات کا میں نے مطالعہ کیا ہے یہ نہایت عمدہ اور جامع ہے۔"

جبکہ اخبار انقلاب نے اس کتاب پر اپنے تبصرہ میں لکھا:

"جناب مرزا صاحب نے اس تبصرہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے جو بڑی بڑی اسلامی جماعتوں کا کام تھا جو مرزا صاحب نے انجام دیا۔ (انقلاب، 16 نومبر 1930ء)

ہندوستان کی تحریک آزادی میں گول میز کانفرنسوں نے ایک متفقہ دستور کے قیام کی راہ ہموار کرنے میں اہم کرذار ادا کیا۔ جو بعد میں 1935ء ایکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ ان تینوں گول میز کانفرنسوں میں قائداعظم اور سر آغا خان نے مختلف اوقات میں شرکت کی۔ مگر چوہدری سر ظفر اللہ خان تینوں کانفرنسوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے شریک رہے۔

آپ نے حضرت مصلح موعود کی ہدایات اور راہنمائی کے مطابق مسلمانان ہند کے حقوق کی جس احسن رنگ میں وکالت کی اس کے نتیجہ میں ہندوستان بھر میں آپ کی مسلم حقوق کے نمائندہ کی حیثیت سے دھوم مچ گئی اور اخبارات نے خوب دل کھول کر آپ کی خدمات کا اعتراف کیا۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے مورخ ڈاکٹر عاشق حسین صاحب بٹالوی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب.... عملی سیاستدان نہ تھے..... انہیں 1931ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت

کے لئے لندن جانا پڑا.... گول میز کانفرنس سے اس قدر برگشتہ خاطر ہوئے تھے کہ استعفیٰ دے کر واپس چلے آئے.... گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین میں سے سب سے زیادہ کامیاب آغا خاں اور چوہدری ظفر اللہ خاں ثابت ہوئے۔" (اقبال کے آخری دو سال، صفحہ 15-14)

ہندو اخبار تیج نے اپنے لندن کے نامہ نگار کے حوالے سے لکھا:

"مسلم ڈیلی گیٹوں میں چوہدری ظفر اللہ خان نے خاص شہرت حاصل کر لی ہے.... وہ اپنی قابلیت کے باعث سر محمد شفیع، مسٹر جناح اور ڈاکٹر شفاعت احمد خاں پر سبقت لے گئے ہیں۔" (بحوالہ الفضل، 7 فروری، 1952)

برصغیر کے نامور صحافی اور مشہور صوفی خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی متولی درگاہ نظام الدین اولیاء نے اپنے اخبار "منادی" میں چوہدری ظفر اللہ خان کی یوں تصویر کشی کی ہے:

"دراز قد، مضبوط اور بھاری جسم عمر چالیس سے زیادہ، گندمی رنگ، چوڑا چکلا چہرہ، فراخ چشم، فراخ عقل، فراخ علم اور فراخ عمل قوم مسلمان عقیدہ قادیانی چپ رہتے ہیں اور بولتے ہیں تو کانٹے میں تول کر اور بہت احتیاط کے ساتھ پورا تول کر بولتے ہیں.... سیاسی عقل ہندوستان کے ہر مسلمان سے زیادہ رکھتے ہیں.... گول میز کانفرنس میں ہر ہندو اور مسلمان اور ہر انگریز نے چوہدری ظفر اللہ خاں کی لیاقت کو مانا اور کہا کہ مسلمانوں میں اگر کوئی ایسا آدمی ہے جو فضول اور بے کار بات زبان سے نہیں نکالتا اور نئے زمانے کی پالیٹکس پیچیدہ کو اچھی طرح سمجھتا ہے تو وہ چوہدری ظفر اللہ ہے..... ظفر اللہ ہر انسانی عیب سے پاک اور بے لوث ہے۔" (منادی 24 اکتوبر 1934ء)

قائداعظم کی تحریک آزادی سے علیحدگی

ہندوستان کے دستور کی تیاری کے حوالے سے ہونے والی گول میز کانفرنسوں میں کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں کے مسلمان علماء اور سیاسی رہنماؤں کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں سے قائداعظم محمد علی جناح شدید الجھن کا شکار ہو کر رہ گئے اور ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی جنگ میں اپنا موثر کردار ادا کرنے میں انہیں نہ صرف کانگرسی بلکہ اپنی جماعت مسلم لیگ کے کانگریسی ذہنیت کے حامل افراد کی سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا رئیس احمد جعفری اپنی

کتاب ”قائداعظم اور ان کا عہد“ میں خود ان کے بیان کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میں حیران ہوں کہ میری ملی خودداری اور وقار کو کیا ہو گیا تھا۔ میں کانگرس سے صلح و مفاہمت کی بھیک مانگا کرتا تھا۔ میں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے اتنی مسلسل اور غیر منقطع مساعی کیں کہ ایک انگریز اخبار نے لکھا مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ سے کبھی نہیں تھکتے۔ لیکن گول میز کانفرنس کے زمانہ میں مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ جیسے ہی خطرہ کے آثار نمایاں ہوئے ہندوینت دل و دماغ کے اعتبار سے اس طرح نمایاں ہوئی کہ اتحاد کا امکان ہی ختم ہو گیا۔ اب میں مایوس ہو چکا تھا۔ مسلمان بے سہارا اور ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ کبھی حکومت کے وفاداران رہنمائی کے لئے میدان میں آموجود ہوتے تھے کبھی کانگرس کے نیازمندان خصوصی ان کی قیادت کا فرض ادا کرنے لگتے تھے۔ مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں ہندوستان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا نہ ہندو ذہنیت میں کوئی خوشگوار تبدیلی کر سکتا ہوں نہ مسلمانوں کی آنکھیں کھول سکتا ہوں۔ آخر میں نے لندن ہی میں بود و باش کا فیصلہ کر لیا۔“

قائداعظم کے اس فیصلہ سے کانگرسی اور ہندو ذہنیت کے مسلمانوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا جو مسلم لیگ میں ہوتے ہوئے مسلم کش پالیسی پر گامزن تھے مگر دوسری طرف مسلمانان ہند جو کہ ہندو اور انگریز کے ساتھ ساتھ انگریز اور ہندو نوازوں کے دو دھاری ظلم کا شکار تھے۔ مسٹر جناح کے اس فیصلہ سے شدید تذبذب اور پریشانی کا شکار تھے کیونکہ وہ براہ راست قیادت سے محروم ہو چکے تھے اور مسلم سیاست پر ایسے لوگ مسلط ہو رہے تھے جن کے دامن ہندو دوستی میں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور جو ”گاندھی جی“ کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کر چکے تھے۔

قائداعظم کی ہندوستان واپسی تحریک

اس مرحلہ پر حضورؓ نے مبلغ انگلستان مولانا عبدالرحیم صاحب درد کو ہدایت فرمائی کہ وہ قائداعظمؒ کو واپس ہندوستان آنے اور مسلمانان ہند کی سیاسی قیادت سنبھالنے کی تحریک کریں۔ چنانچہ مولانا درد نے مارچ 1933ء میں ان کے دفتر واقع کنگز بینچ والو لنڈن (King's Bench Walk London) میں آپ سے ملاقات کی اور تین گھنٹوں کی بحث و تمحیص کے بعد آمادہ کر لیا کہ وہ مسلمانان

ہند کی خدمت کے لئے پھر پبلک میں آئیں نیز بیت الفضل 63 میلروز روڈ لنڈن میں "ہندوستان کا مستقبل" کے موضوع پر لیکچر دینے کے لئے بھی رضامند ہو گئے۔ قائداعظمؒ نے اپنی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ:

"The eloquent persuasion of the Imam left me no escape."

(امام صاحب کی فصیح و بلیغ ترغیب نے میرے لئے کوئی راہ فرار نہیں چھوڑی۔)

یہ تقریر برطانوی اور ہندوستانی پریس کی خاص توجہ کا مرکز بنی اور چوٹی کے اخبارات میں اس کی وسیع اشاعت ہوئی مثلاً:

(1)Madras Mail, 7th April 1933 (2) Hindu Madras, 7th April 1933

(3) Evening Standard, 7th April 1933 (4) Egyptian Gazette Alexandria,

West Africa, 15 April 1933 (5) Statesman Calcutta, 8th April 1933

(6) Sunday Times, London, 9th April 1933.

اس تقریر پر نواب زادہ لیاقت علی خاں اور ان کی بیگم قائداعظمؒ کی خدمت میں لنڈن پہنچے۔ آپ انگلستان کو خیرباد کہہ کر واپس ہندوستان تشریف لے گئے اور پھر آپ کی قیادت میں چند سال کی جدوجہد کے بعد پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ چنانچہ پاکستان کے بزرگ صحافی اور تحریک پاکستان کے ممتاز لیڈر جناب میاں محمد شفیع (م۔ش) ان دنوں کی یادداشتیں رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسٹر جناح ہندوستان کی گندی سیاست سے اس قدر بددل ہو گئے اور رائے عامہ کے ہندوستانی لیڈروں سے اتنے برگشتہ خاطر ہوئے کہ انہوں نے ہندوستانی سیاست سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اس علامت کے طور پر انہوں نے لندن میں قریباً ہمیشہ کے لئے قیام کر لیا۔ یہ مسٹر لیاقت علی خان اور مولانا عبدالرحیم درد امام لندن ہی تھے جنہوں نے مسٹر محمد علی جناح پر زور دیا کہ وہ اپنا ارادہ بدلیں اور وطن واپس آکر قومی سیاست میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس کے نتیجہ میں مسٹر جناح 1934ء میں ہندوستان واپس آئے اور مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں بلامقابلہ منتخب ہوئے۔ (پاکستان ٹائمز' 11 ستمبر 1981ء)

ظفراللہ خان کا مطالبہ آزادی

1945ء میں چوہدری ظفراللہ خان ہندوستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں شرکت کیلئے انگلستان گئے اور انہوں نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بہانگ دہل پہلی بار کسی بین الاقوامی پلیٹ فارم پر برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا:

"اے دولت مشترکہ کے سیاستدانو' کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ ہندوستان کے 25 لاکھ فرزندوں نے میدان جنگ میں مملکت برطانیہ کی آزادی کی حفاظت کے لئے داد شجاعت دی ہو لیکن خود ہندوستان ابھی تک اپنی آزادی کا منتظر اور اس کے لئے ملتجی ہو--- شائد ایک مثال اس کیفیت کو واضح کرنے میں ممد ہو سکے۔ چین کی آبادی اور رقبہ ہندوستان کی آبادی اور رقبے سے بے شک زیادہ ہے لیکن وسعت اور آبادی کے علاوہ باقی ہر لحاظ سے چین آج ہندوستان سے کوسوں پیچھے ہے تعلیم' صنعت و حرفت' وسائل آمدورفت غرض خوشحالی کے تمام عناصر کے لحاظ سے ہندوستان چین سے کہیں آگے نظر آتا ہے پھر بھی کیا وجہ ہے کہ چین تو آج کی دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوتا ہے اور ہندوستان کسی گنتی میں نہیں کیا اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ چین آزاد ہے اور ہندوستان محکوم؟۔"

محترم چوہدری صاحب نے ہندوستان کے عوام کی آزادی کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

"لیکن یہ حالت اب دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ہندوستان بیدار ہو چکا ہے اور آزاد ہو کر رہے گا۔" (تحدیث نعمت' صفحہ 481)

چوہدری ظفراللہ خان کے اس نعرہ مستانہ نے گویا ہندوستان کی سیاست میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ ہندوستان اور بیرونی دنیا کے اخبارات میں کئی روز تک اس نعرہ حق کے چرچے رہے۔

سر ظفراللہ خان کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار پرتاب 22 فروری 1945ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

"ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے جج محمد ظفراللہ خان آج کل لنڈن گئے ہوئے ہیں۔ کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں ہندوستان ڈیلی گیشن کے لیڈر کی حیثیت سے لنڈن میں جو آپ نے تقریریں کی ہیں ان سے ہندوستان تو کیا ساری کامن ویلتھ میں تہلکہ مچ گیا.... آپ نے برطانوی

حکمرانوں کو کھری کھری سنائیں کہ سننے والے دنگ رہ گئے۔ برطانوی حکومت کے درجنوں تنخواہ دار ایجنٹوں کے کئے کرائے پر آپ کی ایک تقریر نے پانی پھیر دیا۔" (پرتاب' 22 فروری 1945ء)

چوہدری ظفراللہ کی تقریر کے نتیجہ میں انگریز حکمران یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب ہندوستانیوں کو غلاموں کی جگہ پر رکھ کر معاملات کو حل کرنا مشکل ہو گا اور اب ان کی سیاسی قوت کو تسلیم کرتے ہوئے صلح جو رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔

چوہدری ظفراللہ خان کی تقریر کے نتیجہ میں برطانوی وزیراعظم لارڈ ویول اور دیگر انگریز سیاستدانوں نے ان سے ملاقاتیں کیں اور نئی تجاویز دیں۔ سر ظفراللہ 5 جون 1945ء کو نئی برطانوی تجاویز کے ساتھ واپس ہندوستان پہنچے اس موقع پر حضرت مصلح موعود نے 22 جون 1945ء کو خطبہ جمعہ میں ہندو اور مسلم رہنماؤں کو اپنے پیغام میں کہا:

"کہ انگلستان صلح کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہے' دو سو سال سے ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے وہ اس پیشکش کو قبول کر کے آئندہ نسلوں پر احسان عظیم کریں۔"

حضرت امام جماعت احمدیہ کے اس خطبہ سے متاثر ہو کر مشہور اہلحدیث عالم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے اپنے اخبار میں لکھا:

"یہ الفاظ جس جرات اور حیرت کا ثبوت دے رہے ہیں کانگرسی تقریروں میں اس سے زیادہ نہیں ملتے چالیس کروڑ ہندوستانیوں کو غلامی سے آزاد کرانے کا ولولہ جس قدر خلیفہ جی کی اس تقریر میں پایا جاتا ہے وہ گاندھی جی کی تقریر میں بھی نہیں ملے گا۔" (اہلحدیث' امرتسر' 6 جولائی 1945ء)

انتخابات 1945ء اور جماعت احمدیہ

قائداعظم نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح کانگرس لاہور ریزولیشن کو قبول کر لے تو ایک عارضی قومی حکومت قائم ہو جائے مگر کانگرس اس پر آمادہ نہ ہوئی۔ حضرت امام جماعت احمدیہ کا بھی یہی خیال تھا کہ ایک وفاقی حکومت قائم ہو جائے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو۔ اس طرح ملک تقسیم ہونے سے بچ جائے گا۔ لیکن کانگرس جو سارے ملک پر حکومت کرنا چاہتی تھی اس تجویز کو

قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ کانگرس کا کہنا یہ تھا کہ مسلم لیگ کوئی چیز نہیں اور کانگرس ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس قضیئے کا تصفیہ انتخابات کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب مفاہمت کی کوئی صورت نہ بنی تو وائسرائے ہند لارڈ ویول نے 19 ستمبر1945ء کو انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا ایسے وقت میں انتخابات بہت اہمیت اختیار کر گئے کیونکہ آئندہ ملک کی تقسیم کا دارومدار ان انتخابات پر ہی تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے یہ انتخابات جیتنے کے لئے مسلمانانِ ہند کو یہ پیغام دیا:

"ہم رائے دہندگان کی رائے اس امر کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ پاکستان چاہتے ہیں یا ہندو راج کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں.... مجھے معلوم ہے کہ ہمارے خلاف بعض طاقتیں کام کر رہی ہیں اور کانگرس ارادہ کئے بیٹھی ہے کہ ہماری صفوں کو ان مسلمانوں کی امداد سے پریشان کر دیا جائے جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہیں یہ مسلمان ہمارے خلاف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے کام میں بطور کارندے استعمال کئے جا رہے ہیں یہ مسلمان سدھائے ہوئے پرندے ہیں یہ صرف شکل و صورت کے اعتبار سے ہی مسلمان ہیں۔" (اخبار انقلاب' لاہور' 18 اکتوبر1945ء)

اس صورت حال کی نزاکت کا حضرت مصلح موعود نے فوراً جائزہ لیا اور آپ کو احساس ہو گیا کہ اگر ان انتخابات میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی بھرپور تائید حاصل نہ ہوئی تو پاکستان کبھی نہیں بن سکتا۔ تحریک پاکستان کے اس اہم ترین مرحلے پر آپ فوراً میدان عمل میں آئے اور جماعت احمدیہ کو یہ پیغام دیا کہ

"آئندہ الیکشنوں میں ہر احمدی کو مسلم لیگ کی تائید کرنی چاہئے تاکہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ بلاخوف تردید کانگرس سے کہہ سکے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔ اگر ہم اور دوسری مسلمان جماعتیں ایسا نہ کریں تو مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کمزور ہو جائے گی اور ہندوستان کے آئندہ نظام میں ان کی آواز بے اثر ثابت ہو گی اور ایسا سیاسی اور اقتصادی دھکا مسلمانوں کو لگے گا کہ چالیس پچاس سال تک ان کو سنبھلنا مشکل ہو جائے گا اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی عقل مند اس حالت کی ذمہ داری اپنے پر لینے کو تیار ہو۔" (الفضل'22 اکتوبر1945ء)

حضرت امام جماعت احمدیہ کا مندرجہ بالا ولولہ انگیز اور تاریخ ساز اعلان اخبارات اور رسائل

نے ہاتھوں ہاتھ لیا چنانچہ خالد اختر افغانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"21 اکتوبر 1945ء کو مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ قادیان نے بیان دیتے ہوئے کہا۔

"میں اب مسلم لیگ سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے بات کروں گا۔ اس کا مطلب تو دروازے کی بجائے سرنگ سے داخل ہونا ہے اس کے معنی مسلم لیگ کی بربادی کے نہیں بلکہ مسلم لیگ کے کیریکٹر اور مسلم قوم کی تباہی کے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلم لیگ کی حمایت کرنا چاہیے۔"

آگے چل کر کہا۔

"ہر احمدی مسلم لیگ کو ووٹ دے تاکہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کانگریس سے بلاخوف تردید کہہ سکے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے اگر ہم اور دوسری جماعتیں ایسا نہ کریں تو مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کمزور ہو جائے گی اور چالیس پچاس سال تک ان کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔" (حالات قائداعظم، صفحہ 314-315)

قائداعظم محمد علی جناح نے انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی ہندوستانی مسلمانوں کے نام پیغام میں کہا:

"ہمارے پیش نظر اہم مسئلہ آئندہ انتخابات کا ہے۔ موجودہ حالات میں انتخابات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انتخابات ہمارے لئے ایک آزمائش کی صورت رکھتے ہیں..... ہم رائے دہندگان کی اس امر کے بارے میں رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ پاکستان چاہتے ہیں یا ہندو راج کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں..... مجھے معلوم ہے کہ ہمارے خلاف بعض طاقتیں کام کر رہی ہیں اور کانگرس ارادہ کئے بیٹھی ہے کہ ہماری صفوں کو ان مسلمانوں کی امداد سے پریشان کر دیا جائے جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ مسلمان ہمارے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہیں۔ یہ مسلمان ہمارے خلاف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے کام میں بطور کارندے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ یہ مسلمان سدھائے ہوئے پرندے ہیں۔ یہ صرف شکل و صورت کے اعتبار سے ہی مسلمان ہیں۔" (اخبار انقلاب' لاہور' 18 اکتوبر 1945ء' صفحہ 8)

قائداعظم کی یہ بات درست نکلی۔ کانگرس نے اپنے زر خرید علماء کو تحریک پاکستان' مسلم لیگ

اور قائداعظم کے خلاف پراپیگنڈا کیلئے پورے ملک میں پھیلا دیا۔ (یہ وہی نام نہاد اسلامی جماعتیں تھیں جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد بھی پاکستان میں مذہب کے نام پر نفرت کے بیج بوئے اور سیاسی حکومتوں کو غیر مستحکم کرنے کیلئے معصوم ذہنوں کو پراگندہ کر کے اپنے غیر ملکی آقاؤں سے دولت حاصل کرتے رہے)

جہاں (قائداعظمؒ کی اصطلاح کے مطابق) کانگرس کے سدھائے ہوئے علماء نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ مرکزی اور صوبائی انتخابات کے ذریعہ تحریک کا نام و نشان تک مٹا ڈالیں وہاں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؒ امام جماعت احمدیہ نے 22 اکتوبر 1945ء کو ایک مفصل مضمون میں اعلان کر دیا کہ:

"آئندہ الیکشنوں میں ہر احمدی کو مسلم لیگ کی تائید کرنی چاہیئے تا انتخابات کے بعد مسلم لیگ بلاخوف تردید کانگرس سے یہ کہہ سکے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔ اگر ہم اور دوسری (مذہبی) جماعتیں ایسا نہ کریں گی تو مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کمزور ہو جائے گی اور ہندوستان کے آئندہ نظام میں ان کی آواز بے اثر ثابت ہو گی اور ایسا سیاسی اور اقتصادی دھکا مسلمانوں کو لگے گا کہ اور چالیس سال تک ان کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی عقلمند اس حالت کی ذمہ داری اپنے پر لینے کو تیار ہو۔" (الفضل، 22 اکتوبر 1945ء، صفحہ 1)

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ اس جماعتی پالیسی کے اعلان سے قبل اپنے خط میں بھی مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی ہدایت جاری فرما چکے تھے۔ جب اس خط کی نقل قائداعظم کی خدمت میں ارسال کی گئی تو انہوں نے بھی امام جماعت احمدیہ کے اس فیصلہ پر خوشی کا اظہار کیا اور امام جماعت احمدیہ کا خط اشاعت کی غرض سے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے حوالے سے ڈان اخبار دہلی کو بھجوایا جو 18 اکتوبر 1945ء کی اشاعت میں چھپا۔

مسلم لیگ نے انتخاب تو جیت لیا مگر کانگریس کی کوشش رہی کہ مسلم لیگ کو اقتدار سے باہر رکھا جائے۔ انتخابات کے بعد 16 جون 1946ء کو پارلیمنٹری مشن نے ملک میں ایک عارضی حکومت بنانے کا اعلان کیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے زعماء کو دعوت دی گئی کہ وہ حکومت میں شامل ہوں۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر کسی جماعت نے عارضی حکومت میں شمولیت سے انکار کیا تو دوسری جماعت

کے اشتراک سے حکومت قائم کی جائے گی مگر جب کانگریس نے انگریز حاکموں کے دعوت نامے کو مسترد کر دیا تو مسلم لیگ کی دعوت قبول کرنے کے باوجود وائسرائے ہند نے عارضی حکومت کی دعوت واپس لے لی۔ جس پر مسلم لیگ نے بھی احتجاجاً اپنی رضامندی منسوخ کرنے کا اعلان کیا۔

مسلمانان ہند نے ملک بھر میں یوم احتجاج منایا اور قائداعظمؒ نے راست اقدام کی دھمکی دی مگر کانگرسی حکومت نے جو انگریز کا واحد جانشین بننے کے خواب کو پورا ہوتے دیکھ کر نشہ میں مخمور ہو چکی تھی اس دھمکی کا جی بھر کر مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ محض گیدڑ بھبکی ہے حکومت سے ٹکر لینا آسان نہیں یہ عیش و عشرت کے خوگر بھلا جنگ ہی کہاں کر سکتے ہیں اگر لڑیں گے تو ہار جائیں گے خود حکومت بھی ان کے مقابلہ کے لئے تیار اور چوکس ہے اور وہ ان نئے سرکشوں اور باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔

اس تاریک ترین دور میں جبکہ نہ صرف مسلم لیگ کا وقار معرض خطر میں پڑ گیا بلکہ تحریک پاکستان کا خاتمہ اور مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت امام جماعت احمدیہ کو خبر دی گئی کہ اس مشکل مرحلے کا حل آپ کے ساتھ بھی وابستہ ہے چنانچہ آپ بعض خدام سمیت 23 ستمبر 1946ء سے لے کر 14 اکتوبر 1946ء تک دلی میں تشریف فرما رہے اور قائداعظم محمد علی جناحؒ، نواب صاحب بھوپال، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب صاحب نشتر، نواب سر احمد سعید خان چھتاری کے علاوہ مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول کو چٹھی بھجوائی کہ جماعت احمدیہ ایک مذہبی جماعت ہے مگر موجودہ سیاسی بحران میں اس کی اصولی ہمدردی تمام تر مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ ایک دوسری چٹھی میں ان پر واضح کیا کہ اگر مسلم لیگ اور کانگرس کی گفت و شنید ناکام ہوتی نظر آئے تو اسے التواء کی صورت قرار دیا جائے تا دونوں سیاسی حلقے مزید غور کر سکیں۔ حضرت فضل عمر کی دعاؤں اور مادی تدابیر نے بالآخر کامیابی کی راہ کھول دی وائسرائے ہند نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مسلم لیگ ہائی کمان نے نہایت درجہ فہم و فراست کا ثبوت دیتے ہوئے اور کانگرس سے سمجھوتہ کئے بغیر عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا اور 13 اکتوبر کو اس کی اطلاع بھی وائسرائے ہند تک پہنچا دی گئی۔ یہ فیصلہ چونکہ انتہائی غیر موافق اور خلاف توقع حالات میں ہوا اس لئے اس نے کانگرس

کے حلقوں میں کھلبلی مچادی اور انہیں بھی پاکستان کی منزل صاف قریب آتے دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ ہندو اخبار "ملاپ" نے صاف لفظوں میں اس رائے کا اظہار کیا:

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ جواہر لال جی اور ان کے ساتھیوں کے جوش آزادی کو تارپیڈو کرنے کا جتن ہے۔" (بحوالہ نوائے وقت '16 اکتوبر 1946ء' صفحہ 3 کالم نمبر 3)

پنجاب کی پاکستان میں شمولیت' جماعت احمدیہ کا کارنامہ

1946ء تک ہندوستان میں تحریک پاکستان اور آزادی کے نعروں کی گونج نے انگریز کو ہندوستان سے بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور کر دیا اور برطانوی حکومت نے تمام اختیارات، ہندوستان اور پاکستان کے سپرد کرنے کا اعلان کر دیا مگر چونکہ وزارتی مشن کے فارمولا کے مطابق تقسیم ہند کی ابتدا صوبوں سے شروع ہونا تھی اور مسلمانوں کے اکثریتی آبادی والے صوبہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی برسراقتدار تھی اس لئے قطعی امکان یہ تھا کہ پنجاب کو پاکستان میں شامل نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ خضر حیات حکومت مستعفی نہ ہو۔ قائداعظم اور دوسرے لیگی رہنما خضر حیات سے مذاکرات کے بعد مایوس ہو چکے تھے۔ اس نازک صورتحال میں چوہدری ظفراللہ خاں لاہور آئے اور خضر حیات خان کو مخلصانہ مشورہ دیا کہ وہ مستعفی ہو کر پاکستان اور مسلم لیگ کے لئے راستہ صاف کریں آخر کار وہ خضر حیات کو قائل کرنے میں کامیاب رہے اور 2 مارچ 1947ء کو خضر حیات نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس استعفیٰ پر مسلمانان ہند نے خوب جشن منایا۔

اخبار "ملاپ" مورخہ 20 فروری 1951ء لکھتا ہے:

"یہ ایک واضح بات ہے کہ چوہدری ظفراللہ خاں صاحب نے خضر حیات کو مجبور کر کے اس سے استعفیٰ دلایا۔ خضر حیات کا استعفیٰ مسلم لیگ کی وزارت بننے کا پیش خیمہ تھا۔ اگر خضر حیات کی وزارت نہ ٹوٹتی تو آج پنجاب کی یہ حالت نہ ہوتی۔"

جماعت احمدیہ کی قیام پاکستان کے تعلق میں ان سب مجاہدانہ اور سرفروشانہ خدمات پر دہلی کے اخبار "ریاست" نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں طنزاً لکھا کہ احمدی آج پاکستان کی تائید کر رہے ہیں مگر جب پاکستان قائم ہو گیا تو دوسرے مسلمان ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھیں گے جو افغان حکومت

نے کابل میں احمدیوں کے ساتھ کیا تھا۔

''اس پر حضرت امام جماعت احمدیہ نے 16 مئی 1947ء کو ایک پر شوکت تقریر فرمائی جس میں مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے مطالبہ پاکستان کی معقولیت و ضرورت پر روشنی ڈالی۔ نیز اعلان فرمایا کہ مسلمان مظلوم ہیں اور ہم تو بہرحال مظلوموں کا ساتھ دیں گے خواہ ہمیں تختہ دار پر لٹکا دیا جائے۔ حضور کی یہ تاریخی اور یادگار تقریر 21 مئی 1947ء کے الفضل میں شائع شدہ ہے۔

احمدی جماعت کی قربانیوں اور جذبوں سے قطع نظر دہلی کے اخبار ''ریاست'' میں یہ پیشین گوئی تقسیم سے قبل ہی سچ ثابت ہوتی ہوئی دکھائی دی جب پنجاب کی تقسیم کے وقت بعض مسلمان جماعتوں کی جانب سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے پراپیگنڈا کی آڑ لے کر انگریزوں نے گورداسپور کو بھارت میں شامل کر دیا اور اگر جماعت خضر حیات کو مستعفی ہونے کیلئے دباؤ نہ ڈالتی تو آج ہم کشمیر کے ساتھ پنجاب کا بھی رونا رو رہے ہوتے۔

30 جون 1947ء کو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لئے ایک حد بندی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا جس کی صدارت سر سیرل ریڈ کلف کو سونپی گئی۔ سکھوں نے مطالبہ کیا کہ اگر کمیشن نے مشرقی پنجاب کی حد دریائے چناب مقرر نہ کی تو سکھ برطانوی سکیم کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ باؤنڈری کمیشن نے 14 جولائی 1947ء کے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ جو جماعتیں کوئی میمورنڈم پیش کرنا چاہیں وہ 18 جولائی تک مع چار زائد نقول اور ایسے چار نقشوں کے پیش کر دیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ صوبے کی حد کس جگہ مقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ کمیشن نے صوبہ پنجاب کے جن پندرہ اضلاع کو متنازع فیہ قرار دیا ان میں گورداسپور اور لاہور کے اضلاع بھی شامل تھے حالانکہ 3 جون کی برطانوی سکیم میں ان کو قطعی طور پر مسلم اکثریت کا ضلع تسلیم کیا گیا تھا۔

کانگریس نواز علماء 1945ء کے الیکشن سے یہ پراپیگنڈا کر رہے تھے کہ احمدی مسلمان نہیں اور یہ خدشہ یقینی تھا کہ ہندو یا سکھ باؤنڈری کمیشن کے سامنے اپنی بحث کے دوران یہ سوال اٹھا دیں گے کہ احمدی چونکہ مسلمان نہیں اس لئے ضلع گورداسپور کی مردم شماری میں ان کو مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے تو یہ ضلع لازماً غیر مسلم اکثریت کا ضلع قرار پاتا ہے اس لئے اسے مشرقی پنجاب میں آنا چاہئے۔ اس تشویشناک صورت حال کے پیش نظر مسلم لیگ کی ہدایت پر جماعت احمدیہ نے مسلم لیگ کے

وقت میں ایک علیحدہ محضرنامہ پیش کیا۔ یہ محضرنامہ نہایت قیمتی، بیش بہا اور مستند معلومات پر مشتمل تاریخی دستاویز ہے جو شائع شدہ ہے جس میں زبردست دلائل سے یہ ثابت کیا گیا کہ مغربی پنجاب کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ گورداسپور کا ضلع مغربی پنجاب میں شامل ہو تا کہ دریائے بیاس کے اس طرف جو مشرقی پنجاب کے علاقے ہیں ان کو پاکستان پر حملہ کرنے کی کھلی چھٹی نہ مل جائے۔

جماعت احمدیہ کے اس محضرنامہ اور وضاحت نے ہندوؤں اور سکھوں کے اس خیال کو پاش پاش کر دیا کہ وہ کانگرسی علماء کے بل بوتے پر اس ضلع کو غیر مسلم اکثریت کا ضلع ثابت کر دکھائیں گے اور اگرچہ ریڈ کلف ایوارڈ اور کانگرس کے گٹھ جوڑ اور سوچے سمجھے منصوبہ کے نتیجے میں اس مسلم اکثریت کے صوبہ کی تین تحصیلوں (تحصیل بٹالہ، تحصیل پٹھان کوٹ و تحصیل گورداسپور) کو ظالمانہ طور پر ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیا گیا مگر ریڈ کلف اپنی بددیانتی اور فریب کاری کے جواز میں احمدیوں کے محضرنامہ کی وجہ سے کوئی دلیل دینے کی جرات نہ کر سکا۔ جماعت احمدیہ نے ضلع گورداسپور اور قادیان کو پاکستان میں شامل کرنے کے لئے دن رات ایک کر کے صوبہ پنجاب اور گورداسپور کی مردم شماری کے تفصیلی اعداد و شمار جمع کئے۔ احمدی پروفیسر، ڈرافٹسمین اور نقشہ نویس پاکستانی حدود کے زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کے لئے سراپا جہاد بن گئے۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ، امام جماعت احمدیہ نے امریکہ اور برطانیہ سے نہایت قیمتی باؤنڈری لٹریچر منگوایا جو بذریعہ ہوائی جہاز ہندوستان پہنچا جس کے ڈاک خرچ پر ہی ہزار روپے سے زائد رقم خرچ کرنا پڑی۔ جماعت احمدیہ نے برطانیہ کے ایک ماہر اور ممتاز جغرافیہ دان ڈاکٹر او سکر ایچ۔ کے۔ سپیٹ (Dr.O.H.K.Spate) کی خدمات بھی حاصل کیں جنہوں نے لنڈن سے ہندوستان پہنچ کر باؤنڈری کمیشن کے دوران جماعت احمدیہ اور مسلم لیگ کے محضرناموں اور بحث کی تیاری میں ہر ممکن مدد دی اور جو خاص طور پر مسلم لیگ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر سپیٹ کے تمام اخراجات تنہا جماعت احمدیہ نے برداشت کئے۔

جہاں تک مسلم لیگ کے کیس کا تعلق ہے اس نازک ترین ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے قائداعظمؒ کی نظر انتخاب احمدیت کے مایہ ناز فرزند چوہدری محمد ظفراللہ خاں صاحب پر پڑی جنہوں نے انتہائی مشکلات اور تیاری کے مختصر ترین وقت کے باوجود مسلم اقلیت کے حقوق کی ترجمانی کا حق ادا کر

دیا۔ آپ نے نہ صرف اپنے قلم سے مسلم لیگی زعماء کے مشورہ سے محضرنامہ کا مکمل متن تیار کیا بلکہ 26 جولائی سے 30 جولائی 1947ء تک حد بندی کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا نقطۂ نگاہ غیر معمولی قابلیت سے نمایاں کر دکھایا۔ آپ کی فاضلانہ اور مدلل بحث ریڈ کلف ایوارڈ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے اور شائع شدہ ہے۔

باؤنڈری کمیشن کے اختتام پر جناب حمید نظامی نے اپنے اخبار "نوائے وقت" لاہور کی یکم اگست 1947ء کی اشاعت میں چوہدری صاحب کی اس فقید المثال خدمت کو سراہتے ہوئے لکھا:

"حد بندی کمیشن کا اجلاس ہوا۔ سنسر کی پابندیوں کی وجہ سے ہم نہ اجلاس کی کارروائی چھاپ سکے نہ اب اس پر تبصرہ ہی ممکن ہے۔ کمیشن کا اجلاس دس دن جاری رہا۔ ساڑھے چار دن مسلمانوں کی طرف سے بحث کے لئے مخصوص رہے۔ مسلمانوں کے وقت میں سے ہی ان کے دوسرے حامیوں کو بھی وقت دیا گیا۔ اس حساب سے کوئی چار دن سر محمد ظفراللہ خاں صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے نہایت مدلل، نہایت فاضلانہ اور نہایت معقول بحث کی۔ کامیابی بخشنا خدا کے ہاتھ میں ہے مگر جس خوبی اور قابلیت کے ساتھ سر محمد ظفراللہ خاں صاحب نے مسلمانوں کا کیس پیش کیا اس سے مسلمانوں کو اتنا اطمینان ضرور ہو گیا کہ ان کی طرف سے حق و انصاف کی بات نہایت مناسب اور احسن طریقہ سے ارباب اختیار تک پہنچا دی گئی ہے۔ سر ظفراللہ خاں صاحب کو کیس کی تیاری کیلئے بہت کم وقت ملا مگر اپنے خلوص اور قابلیت کے باعث انہوں نے اپنا فرض بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ پنجاب کے سارے مسلمان بلالحاظ عقیدہ ان کے اس کام کے معترف اور شکرگزار ہوں گے۔"

اخبار "نوائے وقت" لاہور نے 24 اگست 1948ء کی اشاعت میں حسب ذیل نوٹ بھی لکھا:

"جب قائداعظم نے یہ چاہا کہ آپ پنجاب باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے وکیل کی حیثیت سے پیش ہوں تو ظفراللہ خاں نے فوراً یہ خدمت سرانجام دینے کی حامی بھری.... اور اسے ایسی قابلیت سے سرانجام دیا کہ قائداعظم نے خوش ہو کر آپ کو یو۔ این۔ او میں پاکستانی وفد کا قائد مقرر کر دیا۔ جس طرح آپ نے ملت کی وکالت کا حق ادا کیا تھا اس سے آپ کا نام پاکستان کے قابل احترام خادموں میں شامل ہو چکا تھا۔ آپ نے ملک و ملت کی شاندار خدمات سرانجام دیں تو قائداعظم

انھیں حکومت پاکستان کے اس عہدے پر فائز کرنے پر تیار ہو گئے جو باعتبار منصب وزیر اعظم کے بعد سب سے اہم اور وقیع عہدہ شمار ہوتا ہے۔"

علاوہ ازیں جسٹس محمد منیر صاحب نے جو ریڈ کلف ایوارڈ میں مسلمانوں کی طرف سے ممتاز رکن اور فسادات پنجاب 1953ء کی تحقیقاتی عدالت کے صدر تھے، اپنی عدالتی رپورٹ میں لکھا:

"عدالت ہذا کا صدر جو اس (باؤنڈری) کمیشن کا ممبر تھا اس بہادرانہ جدوجہد پر تشکر و امتنان کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چوہدری ظفراللہ خاں صاحب نے گورداسپور کے معاملہ میں کی تھی یہ حقیقت باؤنڈری کمیشن کے کاغذات میں ظاہر و باہر ہے اور جس شخص کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہو وہ شوق سے اس ریکارڈ کا معائنہ کر سکتا ہے۔ چوہدری ظفراللہ خاں نے مسلمانوں کی نہایت بے غرضانہ خدمات انجام دیں۔ اس کے باوجود بعض جماعتوں نے عدالتی تحقیقات میں ان کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ قابل شرم ناشکرے پن کا ثبوت ہے۔" (رپورٹ عدالتی تحقیقات صفحہ 209)

قیام پاکستان

مسلم لیگ اور جماعت احمدیہ کی کوششوں سے 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ مگر قیام کے ساتھ ہی اس ملک کی مخالفت کرنے والی مجلس احرار سمیت دوسری مذہبی جماعتوں نے اسے غیر مستحکم کرنے کیلئے خود کو پاکستان کا "ماما" بنانا شروع کر دیا اور احمدیوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جماعت احمدیہ کی قربانیوں کے صلے میں آج اس ملک میں احمدیوں کو تیسرے درجے کے شہری کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا۔ 1953ء سے لے کر 1974ء تک مسلسل اسلامی بنیاد پرست جنونیوں کے ہاتھوں ہزاروں احمدیوں کو اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا اور سینکڑوں کو بلاجرم موت کی نیند سلا دیا گیا مگر اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالسلام سے لے کر ایم ایم احمد اور سر ظفراللہ خاں تک کی حب الوطنی اور قومی خدمات میں کوئی کمی نہیں آئی۔

باب 3

فسادات 1953ء اور مجلس احرار

اسلام کے ضابطہ حیات سے دوری کے باوجود مسلمانان پاکستان میں غیر شعوری طور پر مذہبی جنون موجود ہے۔ کوئی بھی سمجھدار اور سازشی انہیں اپنے مذموم مقاصد کیلئے اسلام کا نام لے کر استعمال کر سکتا ہے۔ بد قسمتی سے ہماری قوم کمزور حافظہ کی حامل ثابت ہوئی ہے اور ہر دور میں مختلف سیاسی' مذہبی اور گروہی جماعتوں نے اس بھولی بھالی قوم کو انتہائی عیاری کے ساتھ دھوکا دیکر' ان کے جذبات سے کھیلتے ہوئے اپنے مذموم مقاصد کو کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ مگر ہر بار اس قوم نے اپنے پہلے زخم بھرتے ہی پھر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کسی نئے سازشی کا آلہ کار بننے پر آمادہ ظاہر کیا۔ سازشوں سے بارہا ٹھوکریں اور زخم کھانے کے باوجود بھی ان کی لفظوں کی جادوگری کے سحر میں گرفتار ہوتے رہے۔

تحریک پاکستان کے دوران کھلے لفظوں میں کانگریس کی زبان بولنے والے احراریوں نے قیام پاکستان کے بعد خود کو بہت تنہا اور منتشر پایا۔ ان کے اکثر عمائدین اپنی شکست پر جھاگ کی طرح بیٹھ گئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ہزاروں قربانیاں دیکر آزادی حاصل کر لینے کے بعد قوم انہیں کسی طور پر بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہو گی اور اگر انہوں نے پھر تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ اور پاکستان دشمنی کا رویہ اپنایا تو انہیں شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لہٰذا قیام پاکستان کے ساتھ ہی مجلس احرار نے گرگٹ کے مصداق رنگ بدلتے ہوئے پاکستان کی وفاداری اور حب الوطنی کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ مگر اس راگ کے پیچھے ان کی مجرمانہ ذہنیت چھپی ہوئی تھی جو آزادی کے ایک سال بعد ہی پھر قائداعظم اور مسلم لیگی عمائدین کے خلاف زہر کی صورت میں عیاں ہو گئی۔ مگر اس بار

احراریوں کی پالیسی "بغل میں چھری اور منہ میں رام رام" کے مقولے پر مبنی تھی۔ ایک طرف تو مجلس احرار نے خود کو مسلم لیگ میں مدغم کر کے محب وطن ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا اور دوسری طرف مسلمانوں کے دوسرے فرقوں اور تنظیموں کے نام استعمال کر کے قائداعظم، مسلم عمائدین اور جماعت احمدیہ کے خلاف پراپیگنڈا جاری رکھا۔

1948ء میں جب امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد کوئٹہ میں آرام پذیر تھے تو 11 اگست کو مسلم ایمپلائز ایسوسی ایشن نے ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ اس جلسہ میں احراری مولویوں نے احمدیوں کے کفر اور بد کا تجزیہ اس جذباتی انداز میں پیش کیا کہ سادہ لوح حاضرین مشتعل ہو گئے اور جلسہ گاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک احمدی فوجی میجر ڈاکٹر محمود احمد پر حملہ کر دیا۔

میجر محمود احمد اس وقت اتفاقاً ایک مریض کو دیکھ کر واپس گھر جاتے ہوئے جیپ پر جلسہ کے قریب سے گزر رہے تھے کہ موٹر جلسہ گاہ کے قریب خراب ہو گئی۔ میجر نے موٹر کو اسٹارٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ہجوم نے انہیں آ لیا اور وحشیانہ پتھراؤ اور نوکیلے ہتھیاروں سے تشدد کرتے ہوئے انہیں قتل کر دیا۔ بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ سے معلوم ہوا کہ ان کے جسم پر نوکیلے ہتھیاروں کے چھبیس زخم لگے تھے جن کے باعث میجر محمود احمد کا پیٹ پھٹ گیا اور انتڑیاں تک باہر آ گئیں۔ مگر اس واقعہ کا کوئی مجرم گرفتار نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ اس جلسہ کو مشتعل کرنے والے مولویوں سمیت کسی غازی نے اس اسلامی دہشت پسندی کی بزدلانہ "بہادری" کی ذمہ داری قبول نہ کی۔

پولیس ریکارڈ کے مطابق مشتعل ہجوم چھوٹی داڑھی والے شخص کی تلاش میں تھا تاکہ اسے قتل کر کے بقول مولویوں کے جنت کا "مفت ٹکٹ" حاصل کر سکے۔ کیونکہ احمدی ہمیشہ چھوٹی داڑھی رکھتے ہیں۔ تاہم پولیس "اس عظیم کارنامہ" کو سرانجام دینے والوں کو تلاش نہ کر سکی اور مقدمہ داخل دفتر ہو گیا۔ اس واقعہ کے مجرموں کو نہ پکڑنے کی ایک وجہ مسلم لیگ میں مدغم مجلس احرار کا دباؤ بھی رہا جس کے بارے میں مسلم لیگ کی حکومت کو خدشہ تھا کہ اگر ان کے خلاف کارروائی کی گئی تو یہ حزب مخالف سے مل کر مسلم لیگ حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا موجب نہ بن جائیں گے۔ اور یوں مسلم لیگ کی پہلی "بالیاقت" حکومت نے اپنے مفادات کی حفاظت میں ملک میں موجود

اقلیتی فرقوں کو اس قدر غیر محفوظ بنا دیا کہ پھر ان کا اسلام کے نام پر آج تک قتل عام جاری ہے اور اس انسانیت سوز جرم کے مجرموں کو غازی' شہید کے القابات سے نواز کر نام نہاد اسلامی معاشرے میں اس قدر منزلت حاصل ہوتی ہے کہ عبدالسلام جیسے انسانیت دوست سائنس دانوں کے کارنامے مجرموں کے حق میں بے ہنگم نعروں کے شور میں کہیں دب کر رہ جاتے ہیں۔ احرار کی جانب سے جو کانفرنسیں منعقد کی جارہی تھیں اور جن میں احمدیوں کو برا بھلا کہا جارہا تھا۔ ان کی بنا پر احمدیوں نے بھی اپنے جلسے منعقد کرنے کا اعلان کیا تاکہ عوام کے اندر احمدیوں کے خلاف کئے جانیوالے پراپیگنڈا کا موثر اور مدلل جواب دیا جاسکے۔ ایسا ہی ایک جلسہ 15 جنوری 1950ء کو سیالکوٹ میں منعقد ہوا تو احرایوں نے پتھراؤ کر کے اس جلسہ کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ پولیس نے مداخلت کرتے ہوئے احراریوں کو منتشر کیا تو انہوں نے جلسہ گاہ سے کچھ فاصلے پر جمع ہو کر لاؤڈ سپیکر نصب کر لیا اور احمدیوں کو کافر اور حضرت مرزا غلام احمد بانی احمدیت کا ماسٹر تارا سنگھ سے موازنہ کرتے رہے چوہدری ظفراللہ خان کو غدار قرار دیا گیا اور فحش زبان استعمال کرتے رہے۔ اس جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے احراریوں کے رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے الزام لگایا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان نے مسلمانوں کی مساجد چھین کر مرزائیوں کے حوالے کر دی ہیں۔ جب اس واقعہ کی رپورٹ حکومت کے مشیر قانون کو دی گئی تو انہوں نے سابقہ وکیلوں کو دھراتے ہوئے کہا کہ احراریوں کے خلاف کسی قسم کی کاروائی سے انہیں عوام میں ہمدردیاں حاصل ہو جائیں گی۔

جبکہ اس کیس کے بارے میں جب 13 فروری 1950ء کو سردار عبدالرب نشتر کو آگاہ کیا گیا تو انہوں نے ہدایت کی کہ مجلس احرار کے قائدین کو طلب کر کے مملکت کی سول اور فوجی شخصیتوں کے خلاف مہم کے نتائج سے آگاہ کیا جائے مذہب کے نام پر مملکت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

سردار عبدالرب نشتر کی ہدایت پر مجلس احرار کے صدر ماسٹر تاج الدین کو مشیر قانون نے 20 فروری 1950ء کو طلب کیا اور چوہدری ظفراللہ وزیر خارجہ اور جنرل نذیر احمد ایسے افراد کے خلاف دشنام طرازیوں سے باز رہنے اور نتائج سے متنبہ کیا۔ مجلس احرار کو انتباہ کیا گیا کہ اگر مجلس احرار کے رویہ میں تبدیلی نہ آئی تو حکومت کو اس کے خلاف سخت اقدام اٹھانے پڑیں گے۔

الشہاب کی اشاعت

قیام پاکستان سے قبل دیوبند مسلک کے عالم مولانا شبیر احمد عثمانی نے احمدیت کے حوالے سے ایک پمفلٹ الشہاب کے نام سے تحریر کیا تھا جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ احمدی مرتد ہیں اور اس ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس پمفلٹ کو 30 سال بعد دوبارہ احراری رہنما قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے مصنف کی اجازت سے جو کہ اس وقت تک شیخ الاسلام پاکستان بن چکے تھے، دوبارہ شائع کیا۔ اس پمفلٹ کو ایک فتویٰ کی حیثیت سے شائع کر کے احراریوں نے احمدیوں کے خلاف میزائل کے طور پر استعمال کیا اور اپنی ہر کانفرنس اور جلسہ میں اس کا حوالہ دے کر معصوم ذہن مسلمانوں کو احمدیوں کے قتل عام پر اکسایا جاتا۔

اس پمفلٹ کی اشاعت ایک عرصہ تک جاری رہی جس نے عام شہریوں کو احمدیوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔ حتیٰ کہ احمدیوں کے خلاف عام لوگ بھی ان احراریوں کے بہکاوے میں آ گئے اور ملک کے مختلف حصوں میں احمدیوں کے خلاف انسانیت سوز تشدد کے واقعات رونما ہوئے۔

راولپنڈی اور اوکاڑہ میں مدرس کا قتل

احراریوں کے پراپیگنڈہ کے نتائج قطعی فطری اور شدت انگیز ثابت ہوئے۔ اوکاڑہ میں ایک انیس سالہ نوجوان محمد اشرف نے احراریوں کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ایک احمدی مدرس غلام محمد کو قتل کر دیا۔

اس قتل کی کہانی یوں ہے کہ یکم اکتوبر 1950ء کو مولوی نور دین جو احمدی ہیں اپنے احمدی مبلغین کے ہمراہ اوکاڑہ کے نواحی چک نمبر 5 میں احمدیت کی تبلیغ کیلئے گئے تو مبلغین پر غیر احمدیوں نے توہین آمیز سلوک کیا۔ انہیں گھیرے میں لے کر ان پر کیچڑ پھینکا ان کے چہروں پر سیاہی مل کر گندے پانی میں دھکے دیئے اور اوکاڑہ ریلوے اسٹیشن کی طرف نکال دیا۔

احمدیوں نے اس واقعہ کی اطلاع پولیس کو دی تو انتظامیہ نے ایک شخص مولوی فضل الٰہی کو گرفتار کر لیا مگر احراریوں نے اس معاملے کو خوب اچھالا اور اوکاڑہ میں باقاعدہ ہڑتال کرائی گئی اور

اگلے روز 2 اکتوبر کو جلسہ کا اعلان کر دیا اس جلسہ کے بارے میں خوب زور و شور سے اعلانات کئے گئے اور فضل الٰہی کی گرفتاری کے معاملے کو خوب اچھالا۔ نتیجتاً جب جلسہ شروع ہوا تو ہزاروں افراد اس میں شامل تھے۔ جلسہ میں احراری ذہنیت رکھنے والے مولویوں نے خوب پر اشتعال تقریریں کیں اور ایک مقرر نے تو عوام سے یہاں تک کہا کہ مرزائیوں کی گندگی صاف کی جائے اور اس کو ایمان کا اعلیٰ درجہ تک قرار دیا جاتا رہا۔

ایک نوجوان محمد اشرف جو کہ جلسہ میں شریک تھا اور احراری ملاؤں کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہوا تھا۔ اگلے روز چاقو لے کر ایک احمدی مدرس غلام محمد کے تعاقب میں نکلا اور اوکاڑہ کے راستہ میں نہر کے قریب اسے چاقو کے وار کر کے شدید زخمی کر دیا۔ غلام محمد نے اپنی جان بچانے کیلئے نہر میں چھلانگ لگائی مگر محمد اشرف کی جنونیت انتہا کو پہنچ چکی تھی اور وہ غلام محمد کے تعاقب میں نہر جا کودا اور وہیں چاقوؤں سے جان لیوا وار کئے اور پھر سکون سے فرار ہو گیا۔ غلام محمد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی جاں بحق ہو گئے۔ قاتل کے اپنے بیان سے اس کی احراریوں کے پراپیگنڈا سے ملغوبیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ واردات کے دوران کچھ لوگوں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا تو اشرف نے جواب میں کہا کہ "تمہیں مجھے نہیں روکنا چاہئے کیونکہ میں ایک کافر کو قتل کر رہا ہوں۔"

اوکاڑہ کے واقعہ کے چند ماہ بعد راولپنڈی میں ایک اور احمدی کو قتل کر دیا گیا۔ راولپنڈی کے گوالمنڈی بازار کے علاقہ میں ایک احمدی بدر الدین کو ایک غیر احمدی ولایت خان نامی شخص نے گولی مار دی۔ گو کہ اس قتل کی اصل وجوہات کا پتہ نہ چل سکا تاہم ملزم نے عدالت میں اعتراف کیا کہ اس نے بدر الدین کو اس وجہ سے ہلاک کیا کہ وہ احمدی تھا۔

مجلس احرار کے خلاف خفیہ ادارے کی رپورٹ

19 جون 1950ء کو احمدیوں کے خلاف پر تشدد واقعات کی ابتدا سے قبل ایک رپورٹ حکومت پنجاب کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سی آئی ڈی کو اس تبصرے کے ساتھ پیش کی گئی کہ "اگر مجلس احرار کے رہنماؤں کی تقریروں کے لب و لہجہ کو کنٹرول نہ کیا گیا تو حکومت کو قتل یا ہنگاموں کی چند

وارداتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

اس رپورٹ پر ڈی آئی جی (سی آئی ڈی) نے پورے معاملے کی صحت کا صحیح معنوں میں جائزہ لینے کے بعد اس رپورٹ پر جو نوٹ تحریر کیا یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

"حال ہی میں مجلس احرار نے احمدیہ فرقہ کے بانی اور موجودہ خلیفہ کے خلاف فحش اور ناشائستہ باتیں کہنے کے علاوہ دانستہ اور نادانستہ طور پر تشدد کا پرچار شروع کر دیا۔ یہ امر یاد رہے کہ... کیپٹن کے عہدے کا ایک احمدی افسر کوئٹہ میں وحشیانہ طور پر قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ احمدیوں کے خلاف بعض مظاہرین کے طرز عمل پر اعتراض کیا تھا۔ مجلس احرار برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کے خلاف تھی۔ احرار لیڈروں کا اعتماد حاصل تھا اور کانگرسی کارکنوں کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ تقسیم کے بعد ان کا وقار کم ہو گیا۔ کچھ عرصہ انہیں عوام کے غیض و غضب کا خوف رہا اور وقتاً" فوقتاً" وہ یہ ثابت کرنے کے لئے بیانات دیا کرتے تھے کہ وہ پاکستان کے وفادار ہیں اور جس وقت وہ کلیتہ" اپنا بچاؤ کرتے رہے اور پناہ گزینوں کے کیمپوں اور دوسرے موقعوں پر امدادی کام کرتے تھے۔ ان کے ممبر بکھر گئے تھے۔ اور کچھ عرصہ کے لئے پارٹی ٹوٹ گئی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور سے منتقل ہو کر ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں پناہ گزین ہوئے۔ شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ ان کی سیاسی زندگی ختم ہو چکی ہے اور انہوں نے بین الممکلتی تجارت کے لئے ایک جوائنٹ سٹاک کمپنی کھولی۔ کچھ عرصہ شیخ حسام الدین پبلک سیکورٹی ایکٹ کی دفعہ 3 کے تحت نظر بند رہے۔ کیونکہ پاکستان سے ان کی وفاداری قابل اعتراض تھی۔ ان کے ایک ساتھی مخدوم شاہ بنوری بھی کچھ عرصہ کے لئے نظر بند کئے گئے۔ (2) جب اس صوبہ کی مسلم لیگ میں اختلاف پیدا ہوئے اور اس کے اثر و اقتدار کو شدید دھکا لگا۔ تو احرار نے اس موقعہ کو سیاسی میدان میں داخل ہونے کے لئے مناسب خیال کیا۔ چنانچہ انہوں نے تبلیغی کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ احرار مقررین کی تقریروں میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا تھا کہ وہ پاکستان کے وفادار ہیں یہ کہ وہ مسلم لیگ کو ملک کی واحد سیاسی جماعت تسلیم کرتے ہیں اور یہ کہ جہاد کشمیر حق بجانب ہے اور یہ کہ ملک کے دفاع کو مستحکم بنانے کے لئے رائے عامہ کو تیار کرنا چاہئے۔

بعد ازاں انہوں نے احمدیوں کے خلاف بھی تقریریں کرنی شروع کر دیں۔ مجلس کے پاس بہت

زوردار مقرر ہیں۔ اور جلد ہی سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے گوشہ تنہائی ترک کردیا اور اپنے زورِ بیان کی بدولت ایک بار پھر رائے عامہ کو اپنی پارٹی کی طرف متوجہ کر لیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا تقریروں کا لب و لہجہ پست ہونا شروع ہو گیا۔ پروگرام کی دوسری مدات کو فراموش کردیا گیا اور احرار نے اپنی توجہ احمدیوں پر مرکوز کردیں اور نہایت شرمناک انداز میں انہیں برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ جونہی اعتماد بحال ہوا سر ظفراللہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور انہیں شداد کہا گیا۔ احرار اب اپنا بچاؤ نہیں کر رہے۔ لیکن اب ان کا رویہ جارحانہ ہو چکا ہے۔ معاملہ اب حد سے بڑھ چکا ہے اور نفاست اور سیاسی اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے اور حسب ذیل باتیں جو بڑی اہمیت رکھتی ہیں رونپذیر ہو چکی ہیں:

(1) مرزا غلام احمد کی تحریروں سے غلط ملط حوالے دیئے گئے اور ان کے فحش اور ناشائستہ نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

(2) مرزا غلام احمد اور موجودہ خلیفہ کو زناکار اور غیر فطری مشاغل کا عادی بیان کیا جاتا ہے۔

(3) احمدیوں کو غدار کہا جاتا ہے اور ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے وفادار نہیں ہیں۔

(4) ظفراللہ کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ انہیں اکثر اوقات گدھا اور بیوقوف کہا جاتا ہے اور ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ قادیان میں احمدیوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے کشمیر کا سودا کرلیں گے۔

(5) یہ کہ عوام کے ذہنوں میں خطرہ پیدا کیا جاتا ہے کہ پاکستان پر احمدیوں کی حکومت ہے جو غدار ہیں۔ اس منصوبے کے تحت احمدی فوجی اور سول افسروں کی فہرستیں شائع کی جاتی ہیں۔

(6) سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے اکثر اوقات یہ کہا کہ اگر مرزا غلام احمد ان کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کرتے تو وہ اپنے ہاتھوں سے انہیں ہلاک کرتے۔

(7) احرار کے ایک جلسے میں جذبات کو اس حد تک بھڑکایا گیا کہ حاضرین میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مرزا بشیر الدین کو قتل کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔

(8) ملتان کے ایک جلسے میں جسے سید عطاءاللہ شاہ نے خطاب کیا تھا ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور دریافت کیا کہ اسے جا کر سر ظفراللہ کو ہلاک کر دینا چاہئے۔

(9) ''الشہاب'' نامی کتابچہ مصنفہ شبیر احمد عثمانی جس میں کہا گیا ہے کہ مرزائی مرتد ہیں اور ہر مسلم انہیں قتل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ دوبارہ چھاپا گیا ہے اور تقسیم کیا جارہا ہے (مولانا نے یہ کتابچہ

اس وقت لکھا تھا کہ جب افغانستان میں دو احمدیوں کی سنگساری پر بحث ہوئی تھی)

(3) اس کے برخلاف احرارؔ نے پاکستان کے اقتصادی' سوشل اور سیاسی مسائل میں کوئی تعمیری حصہ نہیں لیا۔ ان کا عملی طور پر اس خواہش کے سوا کوئی پروگرام نہیں تھا کہ وہ آئندہ انتخابات کے لئے مدد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

(4) عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے' باوجود اس کے دو سال قبل احرار کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن وہ بہت سے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور عوامی جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ ان میں سے بہت کم لوگ تھے جنہوں نے احرار کے استحقاق کو چیلنج کیا۔ یا یہ پوچھا کہ احمدیوں کے خلاف یہ غوغام رائی کیوں۔ احرار نے اپنا مقصد جزوی طور پر حاصل کر لیا اور اپنا اعتماد بطور سیاسی پارٹی قائم کر لیا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مسلم لیگ کی طرف ہوں۔ ان کا ایک حصہ ہندوستان میں بھی ہے اگر وہ مخلص ہیں تو انہیں اپنی جماعت توڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہیئے۔

(5) احرار لیڈروں نے یہ احساس نہیں کیا کہ وہ آگ سے کھیل رہے ہیں بعض لغزشوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر دیا گیا ہو کہ قتل' لوٹ اور آبرو ریزی تک نوبت پہنچ جائے تو اس کو ضرور روکا جائے گا۔ یہ مناسب نہ تھا کہ احرار لیڈروں کے خلاف قانونی کارروائی کی جاتی لیکن مزید بحث سے بچنے کے لئے ان کی سرگرمیوں کے خلاف پبلک سیفٹی ایکٹ اور امن عامہ کے تحت کارروائی کی گئی۔ حسب ذیل امور پر غور کیا گیا۔

(ا) جب عملاً تشدد کا ارتکاب ہو تو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ 3 کے مطابق کارروائی کی جائے یا جرم کو روکا جائے۔

(ب) چوہدری سر ظفر اللہ خاں کے خلاف احرار لیڈروں کی چرب زبانی کو برداشت نہ کیا جائے جو شخص عوام میں کابینہ کے کسی وزیر کی ہتک کرے اس کے خلاف سیفٹی ایکٹ کی دفعہ 21 کے ماتحت کارروائی کی جائے۔

(ج) ناشائستہ اور فحش تقریروں کی جو عوامی اخلاق کو خراب کرے اور جن کی زد عوامی شائستگی پر پڑتی ہے برداشت نہیں کیا جانا چاہیئے۔ اکثر اوقات احرار لیڈروں نے کہا ہے کہ مہاتما گاندھی اور ان

کے خلیفہ ایک ساتھ سوئے تھے۔ ایسے گھناؤنے مزاج کو ایک اسلامی مملکت میں برداشت نہیں کیا جانا چاہئے۔

(د) سب سے آخر میں مجلس احرار کو کریمنل لاء اینڈ منٹ ایکٹ 1908ء کی دفعہ 16 کے ماتحت ایک خلاف قانون انجمن قرار دینے کے سوال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

(6) واضح رہے کہ آنریبل وزیر خارجہ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "الشہاب" نامی کتاب جس میں احمدیوں کے خلاف تشدد کی ترغیب دی گئی ہے کو ضبط کرلینا چاہئے۔ یہ بھی واضح رہے کہ انہوں نے بالکل صحیح طور پر یہ کہا تھا کہ اگر اس مرحلے پر احرار پارٹی اور اس کے کارکنوں کے خلاف کارروائی نہ کی گئی تو اس کی ہردلعزیزی بہت بڑھ جائے گی اور بعد میں کوئی کارروائی سیاسی مشکلات پیدا کرنے کے علاوہ انہیں "شہید" بنا دے گی۔ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ذہین اور فہمیدہ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ احراری لیڈروں کی ان تقریروں کو برداشت کیا جائے۔

(7) میں اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا اگر حکومت کو یہ نہ بتاؤں کہ احراری لیڈروں کا پیدا کردہ ماحول خطرناک نتائج پیدا کرنے کا موجب ہو گا اور احمدیوں کے خلاف تشدد کے انفرادی واقعات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ یہ نوٹ ڈی آئی جی' سی آئی ڈی نے چیف سیکرٹری کے پاس بھیجا۔ جنہوں نے اس امر سے اتفاق کیا کہ "الشہاب" کو ضبط کرلیا جائے اور جو لوگ تشدد پر ابھارتے ہیں ان کے خلاف پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ 3 کے تحت کارروائی کی جائے۔ (ملت 14 مئی 54ء، صفحہ 7)

ڈی آئی جی (سی آئی ڈی) کی اس مفصل نوٹ کے بعد بھی صوبے کے منتظم اعلیٰ نے احراری قیادت کے خلاف سخت وارننگ کے علاوہ کسی قسم کا کوئی عملی اقدام نہ اٹھایا جس سے رپورٹ میں بتائے گئے خدشات کو ظہور پذیر ہونے سے روکا جا سکتا اور نتیجتاً احمدیوں کے خلاف بدترین تشدد کے واقعات وقوع پذیر ہوئے۔

احمدیہ فرقے کی جانب سے قتل اور دہشت گردی کے ان واقعات کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔ اس سلسلہ میں "بالیاقت" مرکزی حکومت کے پاس بھی کئی وفود گئے جبکہ 2 اکتوبر 1950ء کو جماعت احمدیہ کراچی کے جلسہ عام میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں احمدیوں کے قتل کے واقعات کی مذمت کرتے ہوئے اسے حکومت کی ناکامی سے تعبیر کیا گیا کہ وہ احراریوں کی جانب سے

عوام کے ایک طبقہ کے خلاف شر انگیز سرگرمیوں کا نوٹس نہیں لے سکی۔ اس قرارداد میں صوبائی اور مرکزی حکومت کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے مناسب اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

اس قرارداد کی روشنی میں مرکزی وزارت داخلہ نے چیف سیکرٹری پنجاب سے ایک مکتوب کے ذریعہ آگاہی چاہی کہ کیا پنجاب میں احمدیوں کے خلاف کسی قتل عام کا خطرہ ہے؟ اس مکتوب کے جواب میں حکومت پنجاب نے وزارت داخلہ کو لکھا کہ "احمدیوں کے خلاف تشدد یا ہنگامہ کا کوئی خطرہ نہیں، قتل کی دونوں وارداتوں کی تحقیقات ہو رہی ہیں اور معاملہ عدالت میں ہے۔ اگر احراری مسلم لیگ سے تعاون کیلئے تیار ہو گئے جیسا کہ معلوم ہوا ہے تو وہ فرقہ وارانہ پراپیگنڈا جس میں احراری ان دنوں مصروف ہیں خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

مگر یہ سب کاغذی کارروائی ثابت ہوئیں اور احراریوں کا احمدیوں کے خلاف پر تشدد رویہ ہر آنے والے روز شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ مگر حکومت کی جانب سے ہمیشہ کی طرح یہ معاملہ پہلو تہی کا شکار رہا اور اس کی اصل وجہ یقیناً بالیاقت مرکزی حکومت اور صوبائی مسلم لیگی قیادت کے درمیان سرکشی تھی جس میں احمدی تاریخ کے بدترین تشدد کا نشانہ بنے اور دولتانہ گروپ ممدوٹ وزارت کو احمدیوں کی لاشوں کی قیمت پر ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

انتخابات 1951ء اور احراریوں کا "یوم تشدد"

1948ء سے 1951ء تک احراری مختلف جلسوں، جلوسوں، کانفرنسوں کے انعقاد کے ذریعے گمراہ کن اور شرربار تقریروں سے عام آدمی کو احمدیت سے متنفر کرنے کا پراپیگنڈا کر کے انہیں احرار سے مانوس کر چکے تھے بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ احراریوں کے پراپیگنڈا نے عام مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لئے احترام اور حتیٰ کہ احراریوں کے نقطہ نظر کے حوالے سے قربانی دینے کے جذبہ تک کی جگہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی جہاں انہوں نے احمدیوں کے لئے پاکستان میں زندگی اجیرن کر دی تھی وہاں انہوں نے مختلف حلقوں میں اپنی حلیف جماعت مسلم لیگ کے لئے انتخابی میدان مارنے کے لئے بھی تیاری کر لی تھی اور عموماً ان کے جلسے جلوسوں اور کانفرنسوں کا سلسلہ ان علاقوں تک ہی

رہا جہاں انہیں یقین تھا کہ مسلم لیگ کے امیدوار سے سخت مقابلہ متوقع ہو گا۔

احراریوں نے اپنی قرارداد لاہور جنوری 1949ء کی رو سے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ مجلس احرار ایک خالص مذہبی جماعت بن جائے گی اور تمام سیاسی معاملات میں مسلم لیگ کی مدد و اعانت کرے گی۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کریں گے بشرطیکہ لیگ کا نامزد کردہ امیدوار احمدی نہ ہو۔ انتخابات مارچ 1951ء میں منعقد ہوئے جس میں مسلم لیگ نے بہت اکثریت سے کامیابی حاصل کی گو کہ ان انتخابات میں حزب اختلاف کی جانب سے "جھرلو" پھیرنے کا الزام لگایا گیا۔ مسلم لیگ نے بعض احمدیوں کو بھی اپنے امیدواروں کے طور پر نامزد کیا تھا لیکن وہ سب کے سب ہار گئے۔ (اس کی غالب وجہ احراریوں کی ان کے حلقہ ہائے انتخابات میں مسلم لیگ سے کیئے گئے وعدہ سے انحراف کرتے ہوئے ان امیدواروں کے مخالف حزب اختلاف کے امیدواروں کی حمایت اور احمدیوں کے خلاف غیر مسلم ہونے کا پراپیگنڈا رہا)

1951ء کے انتخابات کے نتیجہ میں اپریل 1951ء میں مسٹر دولتانہ وزیر اعلیٰ پنجاب قرار پائے۔ چونکہ مجلس قانون ساز میں کوئی احمدی منتخب نہ ہو سکا تھا اس لئے مجلس احرار نے مختلف شہروں میں مختلف تاریخوں میں یوم تشکر منانے کا اعلان کیا مگر اس یوم تشکر کے جلوسوں کی آڑ میں احمدیوں اور ان کے املاک پر پر تشدد حملوں نے اسے "یوم تشدد" بنا کر رکھ دیا۔

لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں 20 اپریل کو مجلس احرار نے یوم تشکر منانے کا اعلان کیا جہاں ایک بڑے جلسہ میں احراری مقرر نے خطاب کے دوران ایک احمدی دکاندار فضل الدین کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں چنانچہ اس پراپیگنڈا کے باعث اس دکاندار پر 7 مئی 1951ء کو اس کی دکان پر احراریوں کے ایک ہجوم نے حملہ کیا جبکہ 13 مئی کو نواحی علاقہ سمندری میں ایک احمدی مسجد کو بھی نذر آتش کر دیا گیا۔

گوجرانوالہ میں اس یوم تشکر کو منانے کا اشتہار 29 مارچ کو دیا گیا اور اگلے دن بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ کے انعقاد کیلئے انتہائی زہریلے انداز میں احمدیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا گیا جس کے نتیجہ میں ایک احمدی اور احراری کے درمیان جھڑپ میں احراری کارکن زخمی ہوا۔

احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ

لاہور میں 25 اور 26 مئی کو مجلس احرار کی جانب سے یوم تشکر منانے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے قبل سید عطا اللہ شاہ بخاری اور محمد علی جالندھری جو کہ مجلس احرار کے روح رواں بنے ہوئے تھے، نے لاہور اور منٹگمری کے جلسوں میں پاک فوج کے ایک میجر جنرل نذیر احمد خاں پر راولپنڈی سازش کیس میں شامل ہونے کا الزام لگایا۔ چونکہ یہ معاملہ قومی دفاع سے متعلق تھا اور پاک فوج کے کسی اہم عہدیدار کے خلاف عوامی سطح پر ایسے الزامات سے مخصوص فرقہ (احمدی) کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ تھا۔ جبکہ مجلس احرار کی جانب سے مسلسل "چور بھی کہے چور" کے مصداق احمدیوں پر بھارت نواز اور اکھنڈ بھارت کی سازش کرنے کے الزامات لگائے جا رہے تھے جبکہ 1949ء تک مجلس احرار کھلے بندوں تقسیم ہندوستان کے خلاف تھی اور اب پاکستان میں رہتے ہوئے عوامی سطح پر گڑبڑ کر کے پاکستان میں مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ملک میں سیاسی عدم استحکام کی پالیسی پر گامزن تھی۔ چنانچہ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجلس احرار کے رہنماؤں کو حکومت کی جانب سے متنبہ کیا گیا کہ اگر انہوں نے دوبارہ ایسے بیانات داغے تو ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ چلایا جا سکے گا۔

یوم تشکر کے پہلے دن تمام پنجاب اور صوبہ سرحد کے اضلاع پشاور، ہری پور ہزارہ کے احراری رضاکار دستوں نے لاہور کے بازاروں میں بینڈ باجے کے ساتھ مارچ کیا۔ اسی روز شام کو جلسہ ہوا جس میں بہت سے مسلم لیگی ارکان اسمبلی بھی شامل تھے۔ اس جلسہ میں صاحبزادہ فیض الحسن نے کہا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے یا انہیں ملک بدر کر کے بھارت واپس بھیج دیا جائے۔ جبکہ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے حکومت کی تنبیہہ کے باوجود میجر جنرل نذیر احمد خان کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میجر جنرل کی گرفتاری سے مملکت ایک بہت بڑے خطرے سے بچ گئی ہے۔

مجلس احرار کے جلسوں میں عوام کے لئے لغویات کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ احمدیوں کے ملک دشمن، چوہدری ظفر اللہ کی پالیسیوں پر لایعنی تنقید اور مذہب کے نام پر عوام کے جذبات کو بھڑکا کر بانی احمدیت، امام احمدیت اور سرکاری عہدوں پر فائز احمدی افسران کے خلاف نعرہ بازی کروائی جاتی۔ احمدیوں کے قتل کو جنت میں داخلے کی ٹکٹ قرار دیا جاتا۔ 19 اگست کو احمدیوں کے خلاف جلسہ سے

خطاب کرتے ہوئے عطاء اللہ شاہ بخاری نے یہاں تک کہہ دیا کہ ”تم کو چاہئے کہ قادیان سے ربوہ تک ہر درخت سے ایک ایک احمدی کو پھانسی پر لٹکا دو، احمدی بھارت کے جاسوس ہیں۔ اگر بھارت کے ساتھ جنگ چھڑ جائے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر احمدیوں کی بیخ کنی کر دی جانی چاہئے جو مملکت کے دشمن ہیں۔ چوہدری ظفراللہ خان وزیر خارجہ پاکستان کے وفادار نہیں۔ وہ قادیان میں احمدیوں کے مفادات پر بھارت سے کشمیر کا سودا کر رہے ہیں۔“

اس جلسہ کی دشنام طرازیوں کی شکایت امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ڈپٹی کمشنر لاہور کو کی مگر اب تو جیسے احمدیوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا کیونکہ مسلم لیگ کے ساتھ بیوروکریسی نے بھی کھلے عام احراریوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا جس کی مثال 24، 25 نومبر 1951ء کو اوکاڑہ میں احراریوں کی کانفرنس سے عیاں ہے۔ اس کانفرنس کا قصہ کچھ یوں ہوا کہ احراریوں نے 25، 26 نومبر کو اوکاڑہ میں ختم نبوت کانفرنس کرنے کا اعلان کیا مگر مقامی پولیس نے تجویز دی کہ اس کانفرنس کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔ چیف منسٹر نے یہ تجویز قبول کر لی مگر اوکاڑہ کے ڈپٹی کمشنر نے نا صرف حکومت سے اس کانفرنس کے انعقاد کی سفارش کر دی بلکہ خود اس کانفرنس میں کرسی صدارت پر بیٹھے۔ اس جلسہ میں احراری رہنما قاضی احسان شجاع آبادی نے یہاں تک کہہ دیا کہ قائد ملت لیاقت علی خان کا قتل جو گزشتہ اکتوبر میں ہوا اس کے پیچھے احمدیوں کا ہاتھ تھا۔ جس سے کانفرنس میں موجود افراد مشتعل ہو گئے اور احمدیوں کے خلاف سخت الفاظ میں نعرہ بازی کرتے رہے۔

جماعت احمدیہ کے جلسہ سے چوہدری ظفراللہ خاں کا خطاب

انجمن احمدیہ کراچی نے 17، 18 مئی 1952ء کو کراچی کے جہانگیر پارک میں ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ یہ جلسہ عام تھا اس لئے کوئی بھی شخص اس میں شامل ہو سکتا تھا۔ اس جلسہ کی خاص بات جو کہ بعد میں احمدیوں کے خلاف احراریوں کی نئی پر تشدد مہم کا جواز بنی' پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری ظفراللہ خاں کے خطاب کرنے کا فیصلہ تھا۔ اس جلسہ سے چند روز قبل وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے چوہدری ظفراللہ خان کو اس جلسہ میں شرکت اور تقریر سے باز رہنے کا مشورہ دیا مگر چوہدری ظفراللہ نے وزیر اعظم سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ اب جماعت سے اس جلسہ عام

میں شمولیت کا وعدہ کر چکے ہیں اور اب وعدہ کے بعد اس جلسہ عام میں شرکت ان کا فرض اولین ہے اگر حکومت کو اس پر اعتراض ہے تو وہ اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے سکتے ہیں مگر جلسہ عام میں شرکت سے گریزاں نہیں ہوں گے۔

مجلس احرار کی جانب سے اس جلسہ کے خلاف عوام میں خوب پراپیگنڈا کیا گیا جبکہ حکومت کو خفیہ اداروں نے متنبہ کیا کہ اس جلسہ عام کے موقع پر احراری جلسہ کو تہہ و بالا کرنے کیلئے شرانگیزی کر سکتے ہیں۔ گو کہ حکومت کی جانب سے تمام حفاظتی تدابیر اختیار کی گئی تھیں مگر اس جلسہ عام کے پہلے ہی دن احراریوں نے جلسہ کی کارروائی میں مداخلت کی اور اس کے خلاف مظاہرہ کیا گیا جس کو روکنے کیلئے انتظامیہ کو مداخلت کرنی پڑی جو مجلس احرار کے لئے ایک جواز تھا جس کا وہ مدت سے انتظار کر رہے تھے۔ پھر کیا تھا کہ پورے کراچی شہر میں فسادات پھوٹ پڑے۔ 18 مئی کو احراریوں نے جلسہ گاہ پر ہلہ بولا اور پولیس اور احراریوں کے درمیان ہونے والی جھڑپوں نے پورے کراچی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے دن کی جھڑپوں میں 60 احراری کارکنوں کو جلسہ گاہ میں پتھراؤ کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے اگلے روز احراریوں نے پورے کراچی میں مظاہرے کئے اور ایک احمدی کے شیزان ہوٹل سمیت' احمدیہ لائبریری اور ایک احمدی کے شوروم اور ایک فرنیچر کی دکان جس کا مالک بھی احمدی تھا' تباہ کر دی۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس: احمدیت کے خلاف نیا "ملا محاذ"

18 مئی کو جونہی چوہدری ظفر اللہ خان نے اپنی تقریر ختم کی تو نہی مولانا لال حسین اختر نے تھیوسوفیکل ہال کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کی ایک کانفرنس طلب کر لی۔ اس اجلاس میں مختلف "مبینہ اسلامی جماعتوں" کے اجتماعی فیصلہ کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا عبد الحامد بدایونی' مولانا جعفر حسین مجتہد' مولانا محمد یوسف اور مولانا لال حسین اختر نے اس متوقع کانفرنس میں پیش ہونے والے مطالبات منظور کئے۔

(1) احمدی غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔

(2) چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ کے عہدہ سے علیحدہ کئے جائیں۔

(3) احمدی تمام کلیدی عہدوں سے ہٹائے جائیں۔

(4) ان مقاصد کے حصول کے لئے آل پارٹیز مسلم کنونشن طلب کیا جائے۔

اس کانفرنس کی صدارت مولانا سلیمان ندوی نے کی۔

"یاد رہے کہ فروری 1998ء میں مولانا سلیمان ندوی کی ایک کتاب کو فرقہ واریت پھیلانے والا مواد قرار دیکر اس پر پابندی عائد کردی گئی ہے" اس کانفرنس میں مولانا سلیمان ندوی کو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کی تیاریوں کے سلسلے میں قائم بورڈ کا صدر بنایا گیا۔ اور ان کے اس عہدے کی توثیق کراچی کے ایک جلسہ عام میں حاصل کی گئی۔ اس کنونشن کے انعقاد کا انتظام کرنے والے بورڈ کے ارکان میں

(1) سید سلیمان ندوی (2) مفتی صاحب داد (3) مولانا عبد الحامد بدایونی (4) علامہ احمد شاہ نورانی (5) الحاج ہاشم گزدر (6) مولانا احتشام الحق (7) مفتی محمد شفیع (8) علامہ محمد یوسف کلکتوی (9) مولانا لال حسین اختر (10) مولانا جعفر حسین مجتہد اور علامہ سلطان احمد شامل تھے ان میں سے بہت سے علماء کرام احمدیوں کے خلاف تحریک کی آڑ میں مرکزی حکومت پر قابض ہونے کے مستحق تھے۔ اور ان میں سے بہت سے جن میں احمد شاہ نورانی وغیرہ بھی اقتدار کی ہوس میں فرقہ واریت کو ہوا دینے سے گریز نہیں کرتے۔

اس بورڈ کا اجلاس 13 جولائی 1952ء کو ہاشم گزدر کے گھر ہوا جس میں کنونشن میں شرکت کے دعوت ناموں کے لیے مندرجہ ذیل جماعتوں کے ناموں کا فیصلہ ہوا۔

جمعیتہ العلمائے پاکستان

جمعیتہ اہلسنّت

موتمر اہلحدیث پنجاب

سفینہ المسلمین

مجلس تحفظ ختم نبوت

جمعیتہ الفلاح

جمعیتہ العلمائے اسلام

تنظیم اہلسنت والجماعت

جمعیتہ اہلحدیث

ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پنجاب

حزب اللہ مشرقی پاکستان

مجلس احرار

جمعیتہ العربیہ

ان جماعتوں کے ناموں سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جماعتیں اسلام کی اشاعت کے لیے کس در مخلص ہوں گی جنہوں نے اپنے گروہی ناموں سے ملک میں شیعہ' سنی اور اہلحدیث کے نام پر فرقہ داریت کو ہوا دے کر اپنی روٹیاں پکی کر رکھی تھیں بلکہ ان جماعتوں کی جنرل باڈیز کے ارکان کی تعداد تانگے کی سواریوں کے بمشکل برابر آتی ہیں۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں ان جماعتوں نے کبھی بھی پاکستان کی فلاح کے لیے کوئی کام نہیں کیا البتہ ہر دور میں منفی پراپیگنڈوں اور مذہب کے نام پر ملک میں سیاسی اور مذہبی اختلاف' شورش اور فساد برپا کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ لوگ جس قسم کے جلسے منعقد کرتے ہیں ان میں سے ایک کا حال نمونہ کے طور پر بتایا جاتا ہے۔ وہ بھی انہی کے ہمدرد' خیر خواہ اور شریک کار' اسلامی جماعت کے ترجمان "جہان نو" کراچی کے ایڈیٹر کی زبانی' وہ بعنوان "مجا" رقمطراز ہیں۔

"کراچی میں ختم نبوت کانفرنس دھوم دھام سے ہوئی' شاہ صاحب کا جلسہ بجلی کے چراغوں سے پوری طرح روشن تھا۔ قدم قدم پر لکڑی کے کھمبوں پر بجلی کی ٹیوبوں سے ایک جنگل بسا رکھا تھا۔ دو دن کے جلسوں میں (رات کے) نو بجے سے صبح کے تین چار بجے تک تقریریں ہوتی رہیں۔ حجاموں' قلیوں اور ہاکروں کی ایک کثیر تعداد سینما کی بجائے وہاں جاتی رہی اور یہی سوچ کر جاتی رہی کہ سینما سے زیادہ لطف ان جلسوں میں ہے' لطیفوں' قصوں' کہانیوں اور شعر خوانیوں اور چٹکلوں سے معمور طول طویل تقریریں ہوئیں' طول طویل اونچے سروں میں نظمیں پڑھی گئیں اور نعتیں سنائی گئیں' کلوم حجام نے کہا "سینما میں کیا مجا آئے گا جو ان جلسوں میں آئے گا' جو ان جلسوں میں آیا میں تو برابر جاتا رہا' دوکان بند کر کے رات کے گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک آج دن بھر سوتا رہا ہوں۔ ابھی

ابھی دوکان پر آیا ہوں۔ اس سے پوچھا تم کیا سمجھے؟ کہنے لگا "سمجھنا کیا ہے بس مجا آگیا! چنانچہ یہی مجا تھا جو اس کانفرنس سے لوگوں نے حاصل کیا" (جہان نو' کراچی' 18 مئی 51ء)

ان جلسوں' کانفرنسوں اور ان میں ہونے والی تقریروں کا جو اخلاقی اثر سامعین پر ہوا ہے۔ اس کا بھی ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے ملاحظہ ہو۔ تاکہ پتہ لگ جائے کہ "قوت قدسیہ" کس قدر "نتیجہ خیز" ثابت ہوتی رہی۔ حضرت شاہ اخبار آزاد نے بتایا ہے کہ

"گزشتہ رات سے عطاء اللہ صاحب بخاری نے 2 رام کراچی میں تقریر کی' جب آپ تقریر کر چکے تو عقیدت مندوں کا ایک جم غفیر سٹیج پر پل پڑا۔ کوئی ہاتھ چوم رہا تو کوئی مصافحہ کر رہا ہے۔ عقیدت مندوں کی یہ گرم جوشی کافی دیر تک جاری رہی۔ اس سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ سے انگوٹھی غائب ہے' لیجئے آپ ختم نبوت کے تحفظ کو آئے تھے کہ خاتم سے ہاتھ دھو بیٹھے" (آزاد' 14 مئی 51ء ص 4)

احرایوں کے جلسوں' کانفرنسوں اور جلوسوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت نے مختلف علاقوں میں دفعہ 144 کا نفاذ کر کے جلسوں اور جلوسوں پر پابندی عائد کردی۔ مگر ان پابندیوں کا کوئی خاص نتیجہ بر آمد ہونے سے قبل ہی ملتان کے تھانہ کپ میں ایک پر تشدد واقعہ کچھ یوں ہوا۔ کہ 18 جولائی 1952ء کو ملتان کے تھانہ کپ کے علاقہ میں احراریوں نے ایک جلسہ و جلوس کا اہتمام کیا۔ چونکہ ضلعی انتظامیہ نے ضلع میں دفعہ 144 کے تحت ایسے مظاہروں اور اجلاسوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ بندا علاقہ کے انسپکٹر نے بزور قوت اس جلسہ عام اور جلوس کو منتشر کر دیا۔ جس پر احراریوں نے پورے شہر میں پراپیگنڈا کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے روز احراریوں کے چند کارکنوں کے ہمراہ پانچ ہزار افراد کا مجمع "توہین رسالت" کے ملزم پولیس والوں کا احتساب کرنے تھانہ کپ پہنچ گیا اور تھانہ کہ آگ لگانے کی کوشش کی جس پر پولیس نے جوابا" کارروائی کرتے ہوئے مظاہرین کی اس بڑی تعداد کو منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج کیا اور آخر کار جب ہجوم آنسو گیس اور لاٹھی چارج سے بھی قابو کرنا مشکل ہوتا نظر آیا تو بالاخر گولی کا سہارا لیا گیا جس سے چھ افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔ مجلس احرار نے اس مسئلہ پر ملک بھر میں مظاہرے کئے۔ اور احمدیوں کی املاک کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔

مسلم لیگ+احراری معاشقہ

اب مسلم لیگیوں نے بھی علی الاعلان مطالبات کی حمایت شروع کر دی تھی۔ لاہور، لائل پور (فیصل آباد)، جھنگ، شیخوپورہ سمیت کئی اضلاع میں بہت سے ایسے اشتہار اور پوسٹر جس پر مختلف مسلم لیگی رہنماؤں کے دستخط ثبت تھے، شائع کئے گئے اور عوام الناس میں احراریوں کے جلسوں میں تقسیم کئے جانے لگے۔

ان اطلاعات پر مسلم لیگ کے صوبائی صدر اور وزیراعلیٰ پنجاب مسٹر دولتانہ نے مسلم لیگ کی پالیسی کو معین کرنا ضروری سمجھا اور یکم اپریل کو اپنے بیان میں کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صوبے کے اندر بعض مقامات پر مسلم لیگ کے ممتاز ارکان نے جن میں بعض مسلم لیگی صدر بھی شامل ہیں احرار کی کانفرنسوں کی صدارت کی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دوسری کانفرنسوں کی صدارت کرنا مسلم لیگ کے نظم وضبط کی خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا میں ہدایت کرتا ہوں کہ آئندہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر مسلم لیگ کے سوا کسی دوسری جماعت کی کانفرس کی صدارت نہ کرے۔ بلاشبہ اس میں ان تقریبات میں شرکت شامل نہیں جن کی نوعیت خالص مجلسی یا غیر سیاسی ہو لیکن سیاسی کی تعریف ڈھیلی ڈھالی نہیں بلکہ کڑی ہونی چاہئے۔ یہ قطعی طور پر ضروری ہے کہ مسلم لیگ کے ممبر کسی ایسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں جس سے پاکستان کے شہریوں کے درمیان منافرت و مخالفت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جس میں پاکستانی شہریوں کے بعض خاص طبقوں یا گروہوں کو دشنام و ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔"

لیکن ان تمام ہدایات کے باوجود اضلاع اور شہروں میں مسلم لیگ کی شاخیں اس تحریک میں نہ صرف معاون بننے لگیں بلکہ مسلم لیگ کی صوبائی اور مرکزی باڈیز کو احراریوں کی حمایت کرنے اور حکومت کی جانب سے احراریوں کی دشنام و ملامت کو روکنے کے لئے مساجد پر عائد دفعہ 144 کو ختم کرنے کی قراردادیں منظور کیں۔

(1) عقیدہ ختم نبوت مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے

(2) سٹی مسلم لیگ اس امر کی شدید مذمت کرتی ہے کہ احکام زیر دفعہ 144 کا اطلاق مساجد پر کیا

گیا ہے اور اس قسم کے احکام نہ صرف غیر ضروری بلکہ عوام کے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں مداخلت خیال کرتی ہے اور پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ایسے احکام کو واپس لے لے۔

(3) سٹی مسلم لیگ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی کے تمام مقدمات واپس لئے جائیں اور جو لوگ اس خلاف ورزی کی بنا پر گرفتار ہوئے ہیں ان کو رہا کیا جائے۔

(4) سٹی مسلم لیگ ایسے افراد کو قانونی امداد فراہم کرے جو دفعہ 144 کے تحت مساجد کے اندر جمع ہونے پر گرفتار کیئے گئے۔ اس کے ٹھیک تین دن بعد 20 جولائی 1952ء کو سٹی مسلم لیگ سرگودھا نے ایسی ہی قرار دادیں منظور کیں۔

(1) سٹی سلم لیگ اتفاق رائے سے اس مطالبہ کی تائید کرتی ہے کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے

(2) سٹی مسلم لیگ صوبہ مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کرتی ہے کہ وہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ ملت میں مزید انتشار پیدا نہ ہو

(3) ان مطالبات کی اہمیت' ان کے متعلق آرا' ان کی نازک نوعیت' اور ملک کے عام احساس کے پیش نظر مرکزی اور صوبائی مسلم لیگیوں کو اس معاملہ میں کچھ عملی قدم اٹھانا چاہئیں۔

جبکہ مسلم لیگ کامونکی سٹی نے بھی اپنی قرار دادوں میں مطالبہ کیا کہ چونکہ پنجاب کے علماء کرام نے اتفاق آراء سے احمدیوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے اس لیے اب احمدی مسلم لیگ کے ممبر نہیں بن سکتے لہٰذا مسلم لیگ کے احمدی ممبروں کو خارج کر دیا جائے۔ اور آئندہ کسی احمدی کو مسلم لیگ کی ممبر شپ کا مستحق نہ سمجھا جائے۔

یہ رویہ اور عدم برداشت' مجلس احرار کی پچھلے چار پانچ سال کی محنت کا ثمر تھا' کہ وہ مسلسل احمدیوں کے خلاف دشنام طرازی کر کے عوام کے معصوم ذہنوں کو عدم برداشت اور جھوٹے پراپیگنڈے کا شکار کر چکے تھے۔ اور ہر ایسا شخص جو کہ پوری نماز نہیں جانتا تھا آج چند شرپسند ملاؤں جو کہ نادیدہ قوتوں کے اشارہ پر پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو خطرات سے دوچند کر رہے تھے جو کہ قیام پاکستان کے روز اول سے مخالفت کرتے آئے تھے' کے دام میں پھنس کر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگ کر گناہ کبیرہ کا شکار ہو چکے تھے۔

صوبہ کی مختلف لیگی تنظیموں کو احراریوں کے حواری بنتے ہوئے دیکھ کر مسلم لیگ پنجاب کے صدر مسٹر دولتانہ نے 28 جون کو لاہور میں پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں سٹی مسلم لیگوں کی جانب سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کے لئے 26-27 جولائی 1952ء میں لاہور میں صوبہ لیگ کا اجلاس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس اجلاس کے جس عارضی ایجنڈے کا اعلان کیا گیا اس میں تحفظ ختم نبوت کا مسئلہ شامل نہیں تھا۔ مگر مسلم لیگیوں کی جانب سے ایجنڈے پر بحث کے لئے جو قرار دادیں پیش کی گئیں ان میں اکثر کا تعلق احمدیوں کو اقلیت قرار دینے' چوہدری ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کرنے سے متعلق تھا۔ جن افراد نے یہ قرار دادیں پیش کیں' ان میں مندرجہ ذیل "لیگی بڑے" شامل تھے۔

(1) صاحبزادہ محمود شاہ گجراتی (کونسلر مسلم لیگ)

(2) قاضی مرید احمد (کونسلر مسلم لیگ)

(3) محمد اسلام الدین (ایم این اے وہاڑی مسلم لیگ)

(4) مولانا احمد سعید کاظمی (ممبر صوبہ مسلم لیگ کونسل ملتان)

(5) خواجہ عبدالحکیم صدیق (صدر سٹی مسلم لیگ ملتان)

(6) صوفی محمد عبدالغفور لدھیانوی (اعزازی آفس سیکرٹری مسلم لیگ ملتان)

(7) محمد ابراھیم قریشی (جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جھاگ)

صوبہ کونسل کا اجلاس 27 جولائی 1952ء کو شروع ہوا تو ختم نبوت کے مسئلہ سے متعلق قرار داد سید مصلح شاہ گیلانی نے پیش کی جس کو آٹھ کے مقابلے میں 284 ووٹوں سے منظور کر لیا گیا۔ قرار داد میں کہا گیا تھا۔

"پنجاب مسلم لیگ کونسل اس صداقت کا پورا شعور رکھتی ہے کہ ختم نبوت دین کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس نے مسلمانان عالم کو ایک روحانی اخوت کے رشتے میں جکڑ رکھا ہے۔ اور جو پاکستان میں ملت مسلمہ کے اتحاد و یگانگت اور سالمیت کی مستحکم بنیاد کا حکم رکھتا ہے۔ اس صداقت کا یہ بنیادی اور طبعی نتیجہ ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے نہ ماننے والے اسلام کے بنیادی دینی عقائد سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں۔ اس موقف کی بنیاد پر نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ایک تجویز یہ

بھی پیش کی گئی ہے جو سیاسی اقدام اور دستوری قانون کے دائرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دستور پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں کونسل کی رائے میں یہ تجویز مسلمانوں کے اس رد عمل کو ظاہر کرتی ہے جو احمدیوں سے نہ صرف مذہبی معاملات میں بلکہ شہری اور مجلسی زندگی میں بھی اکثر علیحدگی کے قومی رجحانات کا اظہار کیا ہے"

صوبہ لیگ کے اجلاس کی یہ قرار داد احراریوں کے مسلم لیگیوں پر واضح اثرات کی غماز ہے کہ ایک طرف تو مسٹر دولتانہ لیگیوں کو احراریوں کی کانفرنسوں کی صدارت سے منع کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کی اپنی جماعت میں احمدیوں کے خلاف احراریوں کی تحریک کو صحیح ثابت کرنے کی دلیلیں دی جارہی تھیں جو کہ قطعی طور پر احراریوں ہی کی پیدا کردہ تھیں۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس

مئی 1952ء میں جہانگیر پارک کراچی کے واقعہ کے بعد احراریوں کے مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں تشکیل کردہ بورڈ کی کوششوں سے بالاخر آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کے انعقاد کے لئے 16-17-18 فروری 1953ء کی تاریخ مقرر پائی۔

اس کنونشن کا آغاز 16 فروری کو ہوا' اس کے پہلے اجلاس میں بڑے بڑے علماء شریک تھے۔ احمدیت کے مسئلہ پر بحث ہوئی اور سبجیکٹ کمیٹی مرتب کی گئی۔ اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل علماء کرام شامل ہوئے۔

(1) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (2) حاجی محمد امین (3) حضرت پیر سر سینہ شریف امیر حزب اللہ (4) مولانا راغب احسن ڈھاکہ (5) مولانا عزیز الرحمان ڈھاکہ (6) مولانا اطہر علی ڈھاکہ (7) مولانا سخاوت الانبیا (8) خلیفہ حاجی ترنگ زئی پشاور (9) مولانا محمد یوسف بنوری ٹنڈو اللہ یار (10) مولانا شمس الحق وزیر معارف قلات (11) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ (12) مولانا احمد علی صدر جمعیتہ العلمائے اسلام۔ لاہور (13) مولانا محمد حسن لاہور (14) مولانا ظفر اللہ عثمانی سیکرٹری تعلیمات اسلامی بورڈ کراچی (15) مولانا سید سلیمان ندوی صدر تعلیمات اسلامی بورڈ کراچی (16) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی (17) مولانا محمد شفیع مفتی دیوبند (18) مولانا محمد ادریس لاہور (19) مولانا مفتی صاحب داد خان

کراچی (20) مولانا عبد الحامد بدایونی (21) مولانا محمد یوسف کلکتوی صدر جمعیت اہلحدیث کراچی (22) مولانا محمد اسماعیل ناظم جمعیت اہلحدیث (23) مولانا سید داؤد غزنوی ایم ایل اے مغربی پاکستان (25) مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت (26) مولانا متین ناظم جمعیت علمائے اسلام کراچی (27) مولانا احتشام الحق کنوینر آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن (28) مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت علمائے پاکستان و مجلس عمل۔

17 جنوری کو سبجیکٹ کمیٹی نے جن قراردادوں کی منظوری دی۔ ان میں کھلی دھمکی دی گئی تھی کہ "چونکہ خواجہ ناظم الدین کی مرکزی حکومت احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے میں لیت ولعل سے کام لے رہی ہے۔ اس لئے آل پارٹیز مسلم کنونشن کے شرکاء کو اپنے مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے ڈائریکٹ ایکشن لینا پڑے گا۔ احمدیوں کا کامل مقاطعہ کیا جائے گا اور خواجہ ناظم الدین کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا گیا۔

جبکہ ان مطالبات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آٹھ افراد پر مشتمل مجلس عمل قائم کی گئی اور اس مجلس عمل کو اختیار دیا گیا کہ وہ مطالبات کی منظوری کے لئے لائحہ عمل تجویز کرے اسی کنونشن میں مولانا عبد الحامد بدایونی کی قیادت میں ایک تین رکنی وفد تیار کیا گیا جس نے بعد میں 22 جنوری کو وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے اپنے مطالبات کے سلسلے میں ملاقات کی۔ جنہوں نے علمائے کرام کے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر کر دی تاہم مجلس عمل نے 23 فروری کو ڈائریکٹ ایکشن کا اعلان کر دیا۔

دوسری طرف مسلم لیگ کی شہری تنظیموں نے بھی حکومت کو قراردادیں ارسال کرنا شروع کر دیں جن میں فوری طور پر مجلس عمل کے مطالبات کو منظور کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا ورنہ دوسری صورت میں حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کے لئے ایم ایل اے حضرات پر دباؤ بڑھانے اور مسلم لیگ کی تنظیموں سے استعفوں کی دھمکی دی گئی تھی۔ ان دھمکیوں کے نتیجہ میں 10 مارچ 1953ء کو مسٹر دولتانہ نے حسب ذیل اعلان کیا:۔

"اس مہینے کی 6 تاریخ کو میں نے اپنی اور اپنی وزارت کی طرف سے اہل پنجاب سے اپیل کی تھی کہ قانون و انتظام کے قیام میں امداد دیں۔

میں نے ان کو یقین دلایا تھا کہ میری حکومت تحریک تحفظ ختم نبوت کے لیڈروں سے فی الفور گفت و شنید شروع کرنے پر آمادہ ہے اور میرے وزراء مطالبات کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر کے سفارش کریں گے کہ ان کو تسلیم کرلیا جائے۔

یہ اپیل اس وقت کی گئی تھی جب لاہور میں قانون کے دشمن لوٹ، آتش زنی اور ضروری سروسوں کو تلپٹ کرنے میں مصروف تھے۔ پاکستان کے مخالف تفرقہ پرداز گروہ پاکستان کی سلامتی اور استواری کو نقصان پہنچانے کی غرض سے تحریک تحفظ ختم نبوت سے فائدہ اٹھا کر نظم حکومت کو درہم برہم کرنے اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کے لئے بدنظمی کی آگ کو بھڑکا رہے تھے۔

میری اپیل کا مقصد یہ تھا کہ صوبے کے باشندے قانون و انتظام کے قیام کے لئے کوشش کریں۔ تاکہ دشمنان پاکستان اس قابل نہ رہیں کہ پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے ایک مذہبی تحریک کے پردے میں اندرونی تفرقوں کو مشتعل کر کے لاقانونیت پھیلا دیں لیکن بدقسمتی سے نتیجہ یہ ہوا کہ میری اپیل کے باوجود لاقانونیت جاری رہی اور لاہور میں صورت حالات پر قابو پانے کے لئے مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔

موجودہ حالات میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے لیڈروں سے گفت و شنید کرنے اور مطالبات پر غور کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ قانون کی اطاعت اور شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کا پختہ بندوبست کرے۔

صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت دونوں کا عزم یہ ہے کہ لاقانونیت جہاں بھی سر اٹھائے گی اسے دبا دیا جائے گا۔ اور صوبے میں قانون و انتظام کو بحال کیا جائے گا۔ حکومت موجودہ خطرے کو جو ملک کی سلامتی اور سالمیت کو درپیش ہے ہر ممکن ذریعے سے کام لے کر دبائے گی۔

میں اس صوبے کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ جہاں کہیں قانون و انتظام کو خطرہ درپیش ہو۔ وہاں اس کی بحالی کے لئے حکومت سے تعاون کریں اور ایسا انتظام کریں کہ دشمنان پاکستان ملک کی سلامتی اور سالمیت کو نقصان پہنچانے کے لئے مسئلہ ختم نبوت کو استعمال نہ کر سکیں۔"

مجلس عاملہ پنجاب مسلم لیگ نے اس بیان کی تائید کی اور اپنے اجلاس منعقدہ 11 مارچ 1953ء میں یہ اعلان کیا کہ مجلس عاملہ اس اپیل کی دلی حمایت کرتی ہے۔ جو باشندگان پنجاب سے کی گئی ہے اور

مزید بر آں پنجاب کے ہر مسلم لیگی کارکن کو ہدایت کرتی ہے کہ اس بیان کی ہدایات پر وفاداری سے عمل کرے۔

فسادات کی کہانی- جسٹس منیر رپورٹ کی زبانی

مجلس احرار اور مجلس عمل کی قادیانیوں کے خلاف تحریک کے حوالے سے جسٹس منیر رپورٹ میں احمدیوں کے خلاف جن مظالم کا ذکر ملتا ہے اور ان سارے حالات میں جو واقعات رونما ہوئے ان کے ذمہ داروں کے بارے میں عدالتی تحقیقات کی کہانی اس رپورٹ کے حوالے سے یہاں دی جاری ہے۔

سیالکوٹ

سیالکوٹ کے واقعات کی کیفیت کے متعلق سرکاری بیان ان تحریری بیانات میں درج ہے۔ جو مسٹر آئی یو خان کمشنر' مسٹر ایس این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس' مسٹر غلام سرور خان ڈپٹی کمشنر اور سید عبدالرؤف سپرنٹنڈنٹ پولیس نے داخل کیے اور جو شہادت لیفٹیننٹ کرنل خوشی محمد نے دی جب مسٹر غلام سرور ڈپٹی کمشنر جن کے خلاف عوام کو بعض شکایات تھیں۔ تبدیل کر دیئے گئے تو ہم نے اپنے چند اجلاس سیالکوٹ میں منعقد کر کے کافی غیر سرکاری شہادت قلمبند کی۔

جب سے مسٹر مظہر علی اظہر 1931ء کی تحریک کشمیر میں احراری رضا کاروں کا ایک دستہ لے کر جموں میں داخل ہوئے تھے۔ سیالکوٹ اسی زمانے سے احراریوں کا ایک ہدایتی مرکز چلا آتا ہے۔ یہ ایک اہم احمدی مرکز بھی رہا ہے جس کی اہمیت قادیان سے دوسرے درجے پر تھی۔ احراری احمدی نزاع کے سلسلے میں یہاں پہلا اہم واقعہ یہ ہوا کہ غلام محمد شاہ نے احمدیوں کے خلاف ایک تیز و تند تقریر کی۔ جس کی پاداش میں وہ زیر دفعہ 295 الف تعزیرات ہند 30 نومبر 1936ء کو سزایاب ہوا۔ یہ نزاع کسی نہ کسی شکل میں 1949ء تک جاری رہا۔ لیکن ان برسوں کے دوران میں کوئی بڑا واقعہ رونما نہ ہوا۔ 26 نومبر 1949ء کو احراریوں نے ایک تبلیغی کانفرنس اس مقصد سے منعقد کی کہ باؤنڈری کمیشن میں احمدیوں کے رویئے کے خلاف نکتہ چینی کریں۔ اس کے جواب میں احمدیوں نے اپنی

پوزیشن واضح کرنے کے لئے۔ 15 جنوری 1950ء کو اپنا ایک جلسہ منعقد کیا۔ عین اس وقت جب یہ جلسہ ہو رہا تھا۔ احراریوں نے ہنگامہ برپا کیا اور ایک لڑکے کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے زیر دفعہ 44 ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کیا جس کے رو سے ایک ہفتے کے لئے جلسے ممنوع قرار دیئے گئے۔ نومبر 1951ء میں احمدی اپنا عام سالانہ اجلاس منعقد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جو جذبات اس وقت پھیل رہے تھے ان کے پیش نظر حکام ضلع نے ان کو سمجھا بجھا کر یہ اجلاس ملتوی کرا دیا۔ پھر یہ اجلاس نومبر 1952ء میں احمدیوں نے اپنے جلسہ گاہ میں منعقد کیا لیکن احراریوں نے حاضرین پر خشت باری کی۔

فروری 1952ء تک احراری احمدیوں کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب احمدیوں کے خلاف شورش نے تحفظ ختم نبوت کی شکل اختیار کی۔ اور 21 جولائی 1952ء کو اس شہر میں ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کی گئی۔ اس کنونشن کے بعد تحریک تحفظ ختم نبوت زیادہ مقبول عام ہو گئی اور تمام فرقوں کے مذہبی مبلغ اس میں شامل ہو گئے۔ تحریک روز بروز زیادہ قوی ہوتی گئی۔ مساجد کے اندر جمعہ کے ہر خطبے میں احمدیوں کے متعلق دشنام و بدگوئی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور تین مطالبات زور شور سے پیش کئے جانے لگے۔ 20 جولائی 1952ء کو پسرور کے مقام پر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کنونشن میں چیف منسٹر نے ایک تقریر کی۔ جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ "تحریک ختم نبوت" کی پوری حمایت کرتے ہیں۔ بشرطیکہ قانون و انتظام کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔" اکتوبر 1952ء میں عرس گلوشاہ کے موقع پر مولوی بشیر احمد خطیب جامع مسجد پسرور، کرامت علی شاہ اور منظور احمد نے احمدیوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان لوگوں کے خلاف زیر دفعہ 21 پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کارروائی کی سفارش کی۔ لیکن حکومت نے ان سے اتفاق نہ کیا۔ نومبر 1952ء میں ایک اور آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں تین مطالبات بیشتر زور شور سے دہرائے گئے۔ صوبائی حکومت اب احراری نزاع کی وسعت اور شدت کا احساس کر چکی تھی چنانچہ اس نے معاملے کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام عام ہدایات کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ ان ہدایات کا مفاد یہ تھا کہ قابل اقدام تقریروں کے خلاف صرف مقدمات دائر کئے جائیں مسجدوں میں گرفتاریاں نہ کی جائیں۔ نہ مساجد کے اجتماعات کو منتشر کیا جائے۔ ایک اور ہدایت یہ تھی کہ

کارروائی صرف احراریوں اور احمدیوں تک محدود رکھی جائے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احراری مولویوں نے ہر مسجد کے منبر سے احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھنے میں اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کیا۔

مجلس عمل پنجاب کی ہدایت کے مطابق اس ضلع میں ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔ اس مجلس عمل نے رضا کاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کا کام شروع کر دیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن ضلع میں جلسوں کا ایک سلسلہ جاری کر کے شدید پروپیگنڈا کرنے میں مصروف رہے۔ 20 فروری 1953ء کو جناح پارک میں ہزارہا آدمی نماز جمعہ کے لئے جمع ہوئے۔ جن سے مولوی محمد علی کاندھوی، پروفیسر خالد محمود، مولوی محمد یعقوب اور مولوی فضل حق نے خطاب کیا۔ احمدی عقائد کے خلاف رسالے اور کتابچے فروخت کئے گئے اور آٹھ آنے کے ٹکٹ بیچ کر ہزاروں روپے جمع کئے گئے۔

کراچی میں 27 فروری 1953ء کو جو فیصلے کئے گئے تھے۔ ان کے مطابق ہوم سیکرٹری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک لاسلکی پیغام بھیجا جس میں قاضی منظور احمد اور ولی محمد جرنیل کو گرفتار کرنے کی ہدایت کی۔ یکم مارچ 1953ء کو شہر نے کامل ہڑتال کی۔ اور دس ہزار اشخاص کا ایک ہجوم ریلوے اسٹیشن پر رضا کاروں کے اس پہلے دستے کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہوا جو زیر سرکردگی مولوی محمد یوسفی "ڈائرکٹ ایکشن" میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ اس ہجوم نے بازاروں میں گشت لگایا۔ احمدیوں کے خلاف نعرے لگائے اور حکومت بالخصوص وزیر اعظم پاکستان کو گالیاں دیں۔ یہ ہجوم اس قدر سرکش تھا کہ اس نے ٹرین کی روانگی میں تاخیر کرا دی۔ اور ٹرین کے بعض ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ بعض آدمی رضا کاروں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گئے اور نارووال پہنچ کر اتر گئے۔ واپس آتے ہوئے انہوں نے ٹرینوں کو روکا۔ اسٹیشن کے دکانداروں کو لوٹا، اور ریل کی پٹڑی کے آس پاس گنے کی فصلوں کو برباد کیا۔

2 مارچ 1953ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ڈی او چٹھی نمبری BDSR-29-2514 مورخہ 28 فروری 1953ء موصول ہوئی جس میں حکومت کو یہ فیصلہ بتایا گیا تھا کہ اس شورش کو سختی سے دبایا جائے۔ انہوں نے پولیس اور مجسٹریٹوں کا اجلاس طلب کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ:۔

(1) 2-3 مارچ 1953ء کی درمیانی رات کو شورش کے نو سرغنہ زیر دفعہ 3۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ

گرفتار کر لئے جائیں۔ (اس کے لئے ہوم سیکرٹری کی منظوری ٹیلیفون پر حاصل کر لی گئی)

(2) جو لوگ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں۔ ان کو حراست میں لے لیا جائے۔ اور پھر کسی دور دست مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔

(3) فوج سے استدعا کی جائے کہ بوقت ضرورت امداد کے لئے موجود رہے۔

2 مارچ 1953ء کی شام کو رام تلائی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں مولوی سلطان محمود' پروفیسر خالد محمود' مولوی حبیب احمد اور مولوی محمد یعقوب نے تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا لہجہ واضح طور پر حکومت کے خلاف تھا اور پروفیسر خالد محمود نے خواجہ ناظم الدین کو آگاہ کیا کہ ان کا انجام بھی مسٹر لیاقت علی خان کا سا ہو گا۔ اعلان کیا گیا کہ کل رضا کاروں کے دو دستے کراچی روانہ کئے جائیں گے۔

مولوی محمد حسین' مولانا محمد علی کاندھلوی' محمد صادق ولد بھولا' مولوی سبیب احمد' عبدالغفور بٹ اور بشیر احمد ولد چراغ دین 2-3 مارچ کی درمیانی رات کو گرفتار کر لئے گئے۔ 3 مارچ کی صبح کو فوج اور پولیس کے دستوں کی گشت کے باوجود چھوٹے چھوٹے ہجوم بازاروں میں نمودار ہوئے۔ یہ ہجوم سرکشی پر مائل تھے۔ لیکن ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے بعض کو فوج نے اور بعض کو پولیس نے منتشر کر دیا۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کوئی سوا دس بجے قبل دوپہر دارالشہابیہ پہنچے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ اس عمارت کے اندر اور اردگرد کے مکانوں کی چھتوں پر ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہے اور حکومت کے خلاف نعرے لگا رہا ہے جب ان سے منتشر ہونے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے شہابیہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کو مجمع خلاف قانون قرار دیا اور مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور خواجہ اقبال احمد مجسٹریٹ کو حکم دیا کہ اس مجمع کو منتشر کر دیں۔ جب مسٹر خلیل الرحمٰن اس عمارت میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا ریوالور کسی نے ان کی پیٹی سے نکال لیا ہے تاہم وہ اور خواجہ اقبال چار اشخاص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ہار پہنے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک مولوی محمد یعقوب تھا جو 2-3 مارچ کی درمیانی رات گرفتار نہیں ہو سکا تھا۔ گرفتاریوں کے بعد ہجوم دارالشہابیہ اور ملحقہ عمارتوں کی چھتوں پر چڑھ گیا اور منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکنے لگا۔ جن کی وجہ سے پولیس نے ان گاڑیوں کے پیچھے پناہ

لی۔ جو دارالشہابیہ کے سامنے سڑک پر کھڑی تھیں۔ خشت باری کی وجہ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے چوٹیں آئیں۔ ایک سب انسپکٹر کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ ایک تنبیہہ کی گئی۔ جس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہجوم برابر منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکتا رہا۔

اس مرحلے پر ایک اور ہجوم دفعتہ" دارالشہابیہ کے عقب میں سڑک پر نمودار ہوا۔ اور اس نے بھی پولیس پر خشت باری شروع کر دی۔ ان کو منتشر ہونے کے لئے کہا گیا لیکن چونکہ انہوں نے خشت باری جاری رکھی۔ اس لئے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ اس پر ہجوم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک آدمی ہلاک پایا گیا۔ اس موقع پر کل اکیس گولیاں چلائی گئیں۔ پولیس نے نعش کو اٹھالیا۔ لیکن ہجوم پولیس پر غالب آیا۔ اس نے نعش بھی چھین لی۔ اور مولوی محمد یعقوب کو بھی حراست سے چھڑالیا۔ چونکہ صورت حالات بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئی تھی اس لئے اس کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل خوشی محمد (ہشتم پنجاب رجمنٹ) کر رہے تھے۔ ہجوم نے سول کے افسروں کو گھیر لیا جو ایک بند گلی میں بھاگے۔ جہاں سے وہ اس گلی کے ایک مکان کی چھت پر پہنچ گئے کچھ دیر بعد وہاں غلام حسن اے ایس آئی کو لایا گیا جن کے پیٹ میں چھرا مارا گیا تھا۔ اور جن کا ریوالور چھین لیا گیا تھا۔ اس اثناء میں ہجوم نے پولیس کی دو گاڑیوں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جیپ کو آگ لگا دی۔ میونسپل فائر بریگیڈ طلب کیا گیا۔ لیکن وہ بھی جلا دیا گیا اس مرحلے پر یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ہجوم ضلع کچہری کی عمارتوں، پولیس کے دفتر اور بعض دوسری سرکاری عمارتوں کو آگ لگانے کے درپے ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کسی نہ کسی طرح باہر نکلے اور انہوں نے پولیس لائن سے ایک گارڈ ساتھ لی۔ تاکہ سرکاری عمارتوں اور سٹیٹ بنک کی عمارت کو بچائیں۔

جس وقت دارالشہابیہ کا واقعہ ہو رہا تھا۔ سٹی انسپکٹر اور سٹی مجسٹریٹ کو رنگپورہ کے چوک سنت سنگھ میں ایک اور ہجوم کا سامنا کرنا پڑا۔ جو دارالشہابیہ کی طرف آ رہا تھا۔ اس ہجوم کو روکا گیا۔ لیکن وہ تشدد پر اتر آیا اور اس نے سٹی مجسٹریٹ سٹی انسپکٹر، اے ایس آئی ثناءاللہ اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو زخمی کر دیا۔ لیکن فوج ان کی مدد کو پہنچ گئی اور انہیں مزید نقصان سے بچایا۔

دوپہر تک ہجوم بے انتہا بڑھ گیا اور ٹریفک ڈیوٹی کے پولیس کانسٹیبلوں پر حملے کرنے لگا۔ اس کے

بعد اس نے ایک جلوس کی صورت اختیار کر لی اور اس شخص کی نعش کو ساتھ لے کر جو دارالشہابیہ میں مارا گیا تھا۔ گشت کرنے لگا۔ یہ ہجوم سٹی مسلم لیگ کے دفتر میں پہنچا اور اس کی لائبریری لوٹ لی۔ خواجہ محمد صفدر ایم ایل اے صدر سٹی مسلم لیگ کو ان کے دفتر سے نکالا گیا۔ ان کا منہ کالا کیا گیا اور ان کو بازاروں میں پھرایا گیا۔ آخر کرنل خوشی محمد نے ان کو چھڑایا۔ اس کے بعد ہجوم جناح پارک میں پہنچا۔ جہاں کوئی پچاس ہزار اشخاص نے مولوی محمد یعقوب کی امامت میں متوفی آدمی کے جنازے کی نماز ادا کی۔ اس موقع پر مولوی نے حسب توقع ایک پر زور تقریر کی۔

کمشنر کو ٹیلیفون پر صورت حالات کے متعلق اطلاع دے دی گئی۔ چنانچہ وہ اسی دن شام کو پہنچ گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے 3 تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر سے لے کر 4 تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر تک چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ پولیس اور فوج کی نفری کم تھی اس لئے یہ کرفیو عمل میں نہ لایا جا سکا۔ اور کمشنر نے اس کے اوقات تبدیل کر کے دس بجے شب سے ساڑھے چار بجے صبح تک کر دیئے۔ اسی شام کو ایک غیر احمدی عبدالحئی قریشی کو جس نے ہجوم کو تشدد سے منع کیا تھا' زدوکوب کیا گیا اور اس کا گھر لوٹ لیا گیا۔

4 مارچ کو زیر دفعہ 144 ضابطہ فوجداری ایک حکم نافذ کیا گیا۔ جس کی رو سے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے۔ اس دن ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی نے اپنا مرکز دارالشہابیہ سے مسجد مولوی نور حسین میں منتقل کر دیا۔ جو تحصیل اور تھانہ صدر کے قریب واقع ہے۔ ایک بڑا ہجوم اس مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ اس کو راستے میں روک لیا گیا۔ کمشنر کی ہدایت کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ لیکن وہ افسروں پر پل پڑا۔ پولیس کو اس ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا جس کے جواب میں آس پاس کے مکانوں سے اینٹیں برسائی گئیں۔ مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سر پر شدید زخم آیا۔ اور پولیس کی ایک گاڑی توڑ پھوڑ دی گئی۔ لہٰذا صورت حالات کا انتظام فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جس نے گولی چلا کر قابو پا لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہجوم پھر مسجد کے سامنے جمع ہو گیا۔ فوج کے افسروں نے ان لوگوں سے بات چیت کی اور ان سے منتشر ہو جانے کی استدعا کی لیکن جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا تو بازار میں ایک طرف سے دوسری طرف تک ایک فیتہ کھینچ دیا گیا اور ہجوم کو تنبیہہ کی گئی کہ اس فیتے کی حد سے آگے نہ بڑھیں لیکن کسی نے فیتہ توڑ

دیا اور فوج کا جھنڈا جلا دیا۔ بعض لوگ تلواریں اور چھرے گھماتے ہوئے ناچنے لگے اور اس روک سے آگے بڑھنے لگے۔ اس پر فوج نے بریگیڈیئر اے کے اکبر کے حکم سے گولی چلائی۔ جس سے چار آدمی ہلاک اور دس مجروح ہوئے۔ اس ہنگامے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جو لیفٹنٹ کرنل خوشی محمد کی زبان سے سنئے۔

"ایک آدمی چھرے گھماتا اور ناچتا ہوا باہر نکلا اور گولی کھانے کے لئے سینہ تان کے کھڑا ہو گیا۔ لیکن میں نے اس کو بتایا کہ جب تک وہ فیتے کی دوسری طرف رہے گا۔ اس کو گولی نہیں ماری جائے گی۔ لیکن جونہی اس نے فیتہ عبور کیا اسے گولی مار دی جائے گی۔ جب گولی چلنی شروع ہوئی تو مجھے وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا تھا۔ پہلی فائرنگ کے بعد ایک مولوی نے سامنے آکر فوج اور پولیس کو گالیاں دیں اور ان کو کافر کہا۔ میں نے بگلر سے کہا کہ بگل بجائے۔ چنانچہ جونہی اس مولوی نے بگل کی آواز سنی وہ ہجوم پر سے پھلانگتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگ گیا۔"

تیسرے پہر ایک ہجوم نے ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل پر یورش کی۔ اے ایس آئی کا ریوالور اور کانسٹیبل کی بندوق چھین لی اور ان کی وردیاں جلا دیں۔ ایک اور پیادہ کانسٹیبل کسی کیس کی مملوکات لئے جا رہا تھا۔ اس پر حملہ کیا گیا اور مملوکات چھین لی گئیں۔ دو احمدیوں کے چھرا گھونپ دیا گیا اور تین دوسرے احمدیوں کے مکانات ہجوم نے لوٹ لئے۔

جب مسٹر ایس این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس شام کو پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معاملات فوج کے حوالے کر رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ حوالگی حق بجانب نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے کمشنر سے مشورہ کر کے صورت حالات کو دوبارہ فوج سے واپس لے لینے کا فیصلہ کر لیا انہوں نے پولیس سے جو 3 اور 4 مارچ کے واقعات سے پست حوصلہ ہو چکی تھی۔ خطاب کیا اور شہر کی گشت کے انتظامات کئے۔ فوج نے اپنا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سٹی کوتوالی میں منتقل کر لیا۔

5 مارچ کو فوج نے شہر بھر میں "فلیگ مارچ" کیا اور وسیع پیمانے پر گشت لگایا۔ بعض جلوس منتشر کئے گئے اور کچھ رضاکار گرفتار کئے گئے۔

6 مارچ کو مسٹر دولتانہ کی اپیل ریڈیو پر نشر کی گئی۔ اور لاسلکی پیغام کے ذریعے سے بھی پہنچائی گئی۔ اس سے یہ خیال پھیل گیا کہ حکومت نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ چنانچہ حکام ضلع کی پوزیشن ناقابل

رشک ہو گئی۔ جو جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے تھے وہ جاری ہو گئے اور روزانہ بے شمار اشخاص گرفتار ہونے لگے۔ 7 تاریخ کو 98، 8 تاریخ کو 121، اور 9 تاریخ کو 149 رضاکار گرفتار کئے گئے۔ جس سے ظاہر تھا کہ عوام پر چیف منسٹر کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

7 مارچ کو پروفیسر خالد محمود اور فضل حق نے تقریریں کیں۔ جن میں پولیس اور فوج سے مطالبہ کیا کہ ہتھیار ڈال دیں اور دوسرے سرکاری ملازموں کو تلقین کی کہ ہڑتال کر دیں اور تحریک میں شامل ہو جائیں۔

10 مارچ تک صورت حالات یہی رہی۔ یہاں تک کہ چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک لاسلکی پیغام پہنچا کہ حکام ضلع ہر قسم کی لاقانونی کو سختی سے کچل دیں۔ اس سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اب حکام ضلع کسی قسم کی لاقانونی کو روانہ رکھیں گے۔ لہٰذا دفعہ 144 کے احکام کی تعمیل ہونے لگی۔ پروفیسر خالد محمود، فضل حق، مولوی سلطان محمود اور دیگر اشخاص مسجدوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ جہاں سے وہ لاؤڈ سپیکر اور خفیہ پیغامات کے ذریعے سے احکام و ہدایات جاری کر کے تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کو مسجدوں کے اندر گرفتار کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ البتہ ان کے خلاف زیر دفعہ 87 و 88 ضابطہ فوجداری کارروائی کی گئی۔ اس سے بہت اچھا اثر ہوا۔ اور 12 مارچ کو ان لوگوں نے مسجدوں سے نکل کر اپنے آپ کو گرفتاری کے بعد شورش عملاً" ختم ہو گئی۔ اور 16 مارچ کو شہر کے حالات بالکل معمول پر آ گئے۔

مذکورہ بالا ماجرا افسروں کے تحریری بیانات اور شہادتوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ غیر سرکاری گواہوں کی جو شہادت سیالکوٹ میں قلمبند کی گئی۔ اس سے اس ماجرا کے کسی حصے کی تردید نہیں ہوئی شہادت میں جس بات پر زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسے آدمیوں کو پٹوایا پٹوایا۔ جو گرفتار ہونے کے بعد جیل میں بند کئے جا چکے تھے۔ انہوں نے خود ایک پولیس کانسٹیبل سے کہہ کر اپنی جیپ کو آگ لگوائی۔ اور خود ہی اس جلوس کی حوصلہ افزائی کی، جو یکم مارچ کو ریلوے سٹیشن پر گیا تھا۔ پہلے الزام سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ گو اس کی تائید میں کافی شہادت موجود ہے۔ دوسرا الزام عام عقل و ہوش کی توہین ہے اور تیسرے الزام کی صحت سے خود مولوی محمد علی کاندھلوی نے انکار کیا ہے۔ ہماری یہ سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ ایک سے زیادہ دفعہ صورت حالات کو فوج کے حوالے کر کے

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دانشمندی اور جرات کا ثبوت دیا اور قانون اور اس کی پشت پناہ قوت کو عام تضحیک و استہزا سے بچالیا۔ اس کے بعد جو خونریزی ہوئی اس کی ذمہ داری اگر اشخاص متعلقہ پر عائد نہیں ہوتی تو اس کا بار پولیس اور ملٹری پر بھی نہیں بلکہ یہ ذمہ داری کسی اور پر عائد ہوتی ہے۔

گوجرانوالہ

گوجرانوالہ احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ اول اس لئے کہ گوجرانوالہ سیالکوٹ کے قریب ہے۔ دوم اس لئے کہ یہ ایک مقبول عام احراری مقرر صاحبزادہ فیض الحسن کا وطن ہے۔

احراریوں نے 1949ء میں یہاں ایک تبلیغی کانفرنس منعقد کی۔ لیکن چونکہ اس وقت تک پاکستان کی نئی مملکت کے متعلق احراریوں کی نیک نیتی پر سخت شبہات موجود تھے۔ اس لئے یہ کانفرنس کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ 1951ء میں انہوں نے "دفاع کانفرنس" کے پردے میں ایک اور کانفرنس منعقد کی۔ یہ اجتماع بہت کامیاب ہوا کیونکہ اس کے انتظامات سٹی مسلم لیگ کے صدر نے کئے تھے۔ اس کانفرنس میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے تقریر کی اور اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ احمدیوں کو قتل کرنا اور ان کی جائیدادوں کو جلا دینا کار ثواب ہے۔ اسی سال میں ایک اور کانفرنس بھی ہوئی۔ جس میں احمدیوں کو کافر قرار دیا گیا۔ اور ان کے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کی حمایت کی گئی۔

20 جون 1952ء "یوم مطالبات" تھا۔ احراریوں نے دفعہ 144 کی خلاف ورزی کر کے مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ اس جلسے میں صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین نے تقریریں کیں جو سب کے سب گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن بعد میں چیف منسٹر کے حکم سے رہا کر دیئے گئے۔ جولائی 1952ء میں ایک اور کانفرنس ہوئی۔ جس میں صاحبزادہ فیض الحسن نے یہ اعلان کیا کہ کسی احمدی کو قتل کرنا رضائے الٰہی کا موجب ہے۔ جب کانفرنس ختم ہوئی تو مولانا اختر علی خان کے اعزاز میں ایک دعوت چائے دی گئی جس میں ڈپٹی کمشنر اور مسلم لیگی لیڈر بھی شامل ہوئے۔ بعد میں احمدیوں نے ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی کہ اس کانفرنس میں ایک مقرر نے حاضرین کو امام جماعت احمدیہ کے قتل پر اکسایا تھا احمدیوں کے خلاف جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر آباد میونسپل کمیٹی نے دو احمدی مدرسوں اور چار احمدی استانیوں کو ملازمت سے برطرف کر

دیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن، مولوی عبدالواحد خطیب مسجد تیرانوالہ باغ اور مولوی محمد اسماعیل نے احمدیوں کے خلاف شورش میں نمایاں حصہ لیا اور دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ 2-3 نومبر1952ء کو گوجرانوالہ میں مجلس عمل کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ جس میں جماعت اسلامی کے ایک نمائندہ میاں طفیل محمد نے بھی شرکت کی مجلس نے احمدیوں کے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کی حمایت کی چنانچہ اس کے بعد اشیائے خوردونوش کی دکانوں پر اس مطلب کے بورڈ لگائے گئے کہ یہاں احمدیوں کو علیحدہ برتنوں میں کھانا دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص عبدالغفار اثر بی اے جو اس سے قبل بازاری عورتوں کے خلاف تحریک میں کامیاب ہوا تھا۔ اس تحریک میں بھی شامل ہو گیا تاکہ اس کا اپنا دائرہ اثر وسیع ہو جائے۔ روزنامہ "زمیندار" کے مالک مولانا اختر علی خان نے تین عام جلسوں میں تقریریں کیں جن میں انہوں نے تحریک کے لئے دو ہزار روپیہ جمع کیا۔ ایک اور جلسے میں جو ان کے گاؤں کرم آباد میں ہوا تھا انہوں نے اس تحریک کے لئے ایک کروڑ روپیہ چندہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ جب کراچی میں وزیر اعظم کو الٹی میٹم دیا جا چکا تو ڈائرکٹ ایکشن کی وسیع تیاریاں شروع ہو گئیں اور مولویوں نے ضلع کے مختلف شہروں میں اپنا پروپیگنڈا بہت تیز کر دیا کامریڈ عبدالکریم اور مولوی عبدالغفور ہزاروی وزیر آباد میں مولوی ابوالحسن محمد یحییٰ اور مولوی فضل احمد حافظ آباد میں، لطیف احمد چشتی اور حافظ عبدالشکور کاموں کے میں اور مولوی عبدالواحد اور مولوی محمد اسماعیل گوجرانوالہ میں مصروف ہو گئے۔ رضاکاروں کی بھرتی جاری ہو گئی حافظ آباد کے لئے پانچ سو رضاکاروں کا کوٹا مقرر کیا گیا تھا۔ جو مجلس عمل کی ترتیب سے ایک ہفتے کے اندر اندر پورا ہو گیا۔ پورے ضلع کی بھرتی کا کوٹا ساڑھے چار ہزار تھا اور جن لوگوں نے رضاکاروں کے حلف نامے پر دستخط کئے ان میں مسٹر منظور حسن سیکرٹری سٹی مسلم لیگ بھی شامل تھے۔

شورش اس وقت شروع ہوئی۔ جب صوبائی حکومت کے احکام کے ماتحت مولوی محمد اسماعیل خطیب مسجد اہل حدیث گرفتار کر لئے گئے۔ یہ روز کا معمول ہو گیا کہ لاہور جانے سے پہلے رضاکاروں کے جلوس نکالے جاتے اور جلسے منعقد کئے جاتے۔ مجلس عمل ختم کر دی گئی اور حکیم عبدالرحمٰن نائب صدر مجلس احرار گوجرانوالہ تحریک کے ڈکٹیٹر مقرر کئے گئے۔

2 مارچ کو چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک ڈی او چٹھی نمبری BOSB 29 - 2514 مورخہ 28

فروری 1953ء ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو موصول ہوئی۔ جس میں مزید گرفتاریوں سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن یکم مارچ 1953ء کو اے ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی کی طرف سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ ہدایات پہنچیں کہ رضاکاروں کے دستوں کو لاہور اور کراچی کی طرف روانہ ہونے سے روکا جائے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں گوجرانوالہ میں گرفتار کیا جائے۔ دونوں ہدایات ایک دوسرے کے متضاد تھیں اور چونکہ مجسٹریٹوں اور پولیس نفری کی کمی اور جیل میں جگہ کی قلت کے باعث حکام ضلع گرفتاریوں کے حق میں نہ تھے اور ایک آدھ دن اور صورت حالات کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا لاہور کے حکام اعلیٰ پولیس سے استفسار کیا گیا کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ اس سے قبل رضاکاروں کی گرفتاری کے متعلق جو حکم دیا جا چکا ہے۔ اس کی تعمیل کی جائے اور اگر جیل میں کافی جگہ نہ ہو تو گرفتار شدہ اشخاص کو دور دست دیہات میں جمع کر دیا جائے۔

2 مارچ کو دس بجے ڈپٹی کمشنر کے کمرہ عدالت میں سرکاری اور غیر سرکاری آدمیوں کا ایک اجلاس ہوا۔ سٹی مسلم لیگ کے عہدہ داروں نے اس اجلاس میں موقع پا کر لیگ کے اندر اپنے مخالفین کی مذمت کی اور حکام ضلع کے ساتھ سرگرم تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ اس مرحلے پر لاہور جانے والی ٹرینوں کو ان ہجوموں نے روکنا شروع کیا۔ جو لاہور جانے والے رضاکاروں کی مشایعت کے لئے ریلوے سٹیشن پر جمع ہو جاتے تھے۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پولیس کا ایک دستہ ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن پر گئے اور انہوں نے پچاس رضاکاروں کے ایک دستے کو ٹرین سے اتار کر گرفتار کر لیا۔ اس پر ہجوم میں جوش پھیل گیا اور اس نے دو دفعہ ٹرین کو روکا۔ جب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ٹرین کو روانہ کرنے کی دوسری کوشش کی تو ان پر حملہ کیا گیا جس سے دو اور چار پولیس مین زخمی ہو گئے۔ جن میں ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔ اسی دن شام کو پانچ ہزار کے ایک جوش میں بھرے ہوئے ہجوم نے ریلوے سٹیشن سے کچھ فاصلے پر سندھ ایکسپریس کو روک لیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس چھ پیادہ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے لیکن ان پر اینٹوں اور پتھروں کی بوچھاڑ کی گئی۔ چونکہ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور اگر ہجوم منتشر نہ ہوتا تو تشدد پر اتر آتا اور ٹرین کے مسافروں کی پریشانی کا باعث ہوتا۔ اس لئے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تین پیادہ کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ بارہ راؤنڈ ہوا میں چلائیں۔ اس سے ہجوم منتشر ہو گیا۔ کسی کا جانی نقصان نہ ہوا۔ اس کے بعد معززین شہر کا ایک

اجلاس ریلوے سٹیشن پر طلب کیا گیا۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس غنڈے پن کی مذمت کر رہا تھا۔ لیکن کسی قسم کی عملی امداد کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ مبادا وہ کافریا مرزائی قرار دیا جائے۔

چونکہ مجلس عمل کے عہدہ داروں نے مجلس عمل کی حمایت کا عہد کر رکھا تھا۔ اس لئے مجلس عمل کے ڈکٹیٹر نے مسٹر منظور حسن ایم ایل اے سیکرٹری مسلم لیگ سے مطالبہ کیا کہ وہ ایک دستے کی قیادت کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں۔ لیگ کے صدر شیخ آفتاب احمد نے تجویز کی کہ شیخ منظور حسن کی فرضی اور بناوٹی گرفتاری کا انتظام کیا جائے۔ تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ تحریک کو لیگ کی حمایت حاصل ہے۔ اس پر اتفاق ہو گیا۔ شیخ منظور حسن گرفتار کیے گئے۔ اور انہیں پولیس کی ایک جیپ میں بٹھا کر ضلع کے ایک دور دست گوشے میں اتار دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ چند روز تک گوجرانوالہ واپس نہ آئیں لیکن لوگ اس چال کو سمجھ گئے اور دوسرے دن کوئی دو سو آدمی شیخ آفتاب احمد کے مکان پر پہنچے اور ان سے کہنے لگے کہ ایک جلوس میں شامل ہوں۔ وہ زبردستی مکان سے باہر نکالے گئے اور ان کو ایک جلوس کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا گیا جو مسجد شیرانوالہ باغ کو جا رہا تھا۔ اس وقت تک مسٹر منظور حسن گوجرانوالہ واپس آ چکے تھے اور مسجد شیرانوالہ باغ میں پہنچ کر شورش پسندوں میں شامل ہو چکے تھے اور انہوں نے احمدیوں اور حکومت کے خلاف کئی تقریریں کیں اور سات مسلم لیگ کونسلروں کو ساتھ لے کر ایک جلوس کی قیادت کی یہ سب لوگ گرفتار کر لئے گئے۔

چیف منسٹر کا بیان مورخہ 6 مارچ لاہور کی ہدایات کے مطابق شہر بھر میں نشر کر دیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ملی کہ 7 مارچ کو احمدیوں کے جان و مال پر حملوں کا خطرہ ہے۔ اس صورت حالات پر فوج سے گفتگو کی گئی۔ فوج نے تجویز کی کہ دفعہ 144 کے ماتحت عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے جائیں لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی کمشنر نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ اور اس کے بجائے فیصلہ کیا کہ فوج اور پولیس مل کر شہر میں گشت کریں۔ اس کے بعد شہر میں لاقانونی کے کسی واقعہ کی اطلاع نہیں آئی سوائے اس کے کہ ایک احمدی کی دکان کو لوٹنے کی کوشش کی گئی۔

7 مارچ کو موضع نند پور میں شورش پسندوں کے ایک پر غیظ ہجوم نے ایک شخص محمد حسین کو یہ سمجھ کر قتل کر دیا کہ وہ احمدی ہے۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ متوفی کے ایک دشمن نے اس کو قتل کرانے کے لئے چال چلی تھی۔

8 مارچ کو مقامی ایم ایل اے مسجد شیرانوالہ باغ میں طلب کئے گئے اور ان سے درخواست کی گئی کہ لاہور جا کر ہدایات لائیں، یہ ایم ایل اے چیف منسٹر صاحب سے ملے لیکن کوئی قطعی ہدایات نہ لائے۔

گوجرانوالہ میں فوج کی ایک کمپنی 5 مارچ کو، دو بٹالین، 6 مارچ کو اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کنسٹیبلری کے دو ریزرو دستوں کو ساتھ لے کر 8 مارچ کو پہنچ گئے۔

جب فوج آئی تو ان نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا "پاکستانی فوج نے سیالکوٹ گولی چلانے سے انکار کر دیا، زندہ باد پاکستانی فوج زندہ باد" شورش پسند ہر جگہ یہ اعلان کر رہے تھے۔ کہ وہ کفر کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں اور کئی مقامات پر ایسے پوسٹر لگائے گئے۔ جن میں پولیس اور فوج سے اپیل کی گئی تھی کہ گولی نہ چلائیں۔ بلکہ جہاد میں شامل ہو جائیں۔

ضلع میں کوئی ایک درجن احمدیوں کو مجبور کر دیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کر لیں۔

اس ضلع میں مسلم لیگ اس تحریک سے عملی رابطہ رکھتی تھی۔ گوجرانوالہ کی سٹی مسلم لیگ نے تحریک ختم نبوت کی حمایت میں قرارداد منظور کی اور اس کے سیکرٹری مسٹر منظور حسن نے اسی مطلب کی ایک قرارداد صوبہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لاہور میں پیش کرنے کے لئے ارسال کی۔ انہوں نے اسی قسم کی ایک قرارداد آل پاکستان مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکہ میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی۔

احمدیوں کا ایک وفد 20 مارچ کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے پہلے دن میں نے چیف منسٹر سے ہدایات طلب کی تھیں اور انہوں نے ہدایات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ مرکز نے معاملے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

کمک پہنچنے کے بعد غنڈوں کی گرفتاریاں اور ناجائز اسلحہ کے لئے تلاشیاں شروع ہو گئیں مولوی عبدالواحد جو تحریک کی پشت پر تھے اور حکیم عبدالرحمٰن ڈکٹیٹر علی الترتیب 11 اور 12 مارچ کو گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد چند اور مولوی آگے آئے اور وہ بھی گرفتار کر لئے گئے۔ بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ فوج کی امداد سے مسجد شیرانوالہ باغ پر چھاپا مارا جائے۔ چھاپا مارا گیا۔ مسجد شورش پسندوں سے پاک

کر دی گئی اور دس ہزار ایک سو روپے کی رقم قاری عبدالکریم سے حاصل کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقم شیخ آفتاب احمد، مرزا شریف بیگ، محمد دین۔ ایم۔ اے، عزیز انصاری اور گوجرانوالہ مسلم لیگ کے بعض کونسلروں نے فراہم کی تھی۔

صفدر علی اور نصیر دین عرف نصیریا غنڈوں کے دو مشہور لیڈر تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ اول الذکر کسی نہ کسی طرح ضلع سے باہر نکل گیا اور ازاں بعد جھنگ میں گرفتار کیا گیا، نصیریا بھی کچھ مدت تک گرفتاری سے بچتا بچاتا رہا لیکن آخر اس کا سراغ لگا کر اس کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

ضلع میں شورش کے دوسرے مرکز حسب ذیل تھے۔

(1) کامونکے:

یہاں احمدیوں اور حکومت کے خلاف مظاہرے اور جلوس مرتب کرنے والے لطیف احمد چشتی اور حافظ عبدالشکور تھے۔ جو سرمایہ ضبط کیا گیا اس کی مقدار دس ہزار سات سو بہتر روپے تھی۔

(2) وزیر آباد:

یہاں تحریک کی تنظیم کرنے والے مولوی عبدالغفور ہزاروی اور کامریڈ عبدالکریم تھے۔ یہاں ریل کی پٹڑی پر لکڑی کا ایک لٹھا رکھ کر ایک ٹرین روک دی گئی۔ جو سرمایہ یہاں ضبط کیا گیا اس کی مقدار دو ہزار پانچ سو ساٹھ روپے تھی۔

(3) حافظ آباد:

یہاں ابوالحسن محمد یحییٰ اور مولوی فضل الٰہی نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا۔

(4) گکھڑ:

یہاں ٹرینیں روکی گئیں۔ میر محمد بشیر صدر گکھڑ مسلم لیگ نے مع چند کونسلروں کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔

(5) نوشہرہ ورکاں:

ایک پرانا کانگرسی ڈاکٹر محمد اشرف یہاں گڑبڑ کا ذمہ دار تھا۔

(6) سوہدرہ:

یہاں مولوی عبدالمجید اہل حدیث نے عام جلسوں کا اہتمام کیا۔

راولپنڈی

یہاں بھی فسادات کے آغاز سے پیشتر واقعات کی رفتار باکل صوبے کے دوسرے قصبوں ہی کی مانند تھی احراریوں نے احمدیوں اور ان کے مذہب کی خدمت سے کام کا آغاز کیا۔ اس کے جواب میں احمدیوں نے احراریوں کے ماضی کو اجاگر کرنا شروع کیا۔ تاکہ پاکستان کے متعلق ان کی نیت کی نسبت جو شبہات تھے۔ وہ قوی ہو جائیں۔ آل پارٹیز مسلم کنونشن کے بعد احراری دوسرے مذہبی فرقوں سینوں اور پیروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مساجد احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا کا مرکز بن گئیں۔ اور جمعہ کے خطبات تو احمدی عقائد کی ندامت و مخالفت کے لئے وقف ہی کر دیئے گئے۔ نومبر 1952ء میں عطاءاللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے جو احراریوں کے بڑے لیڈروں میں سے ہیں۔ لیاقت باغ کے ایک جلسہ عام میں تقریریں کیں۔ اس کے بعد رضاکاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کی مہم شدت سے شروع کر دی گئی۔

جب کراچی میں تحریک کے لیڈر گرفتار کر لئے گئے اور مولوی غلام اللہ خان کو بھی 27 فروری کو حکومت پنجاب نے گرفتار کر لیا۔ تو دھڑا دھڑ جلوس اور جلسے منعقد ہونے لگے۔ ایک جلسہ عام جو لیاقت باغ میں پیر صاحب گولڑہ شریف کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ وہ سب سے بڑا جلسہ تھا۔ جس کی نظیر ماضی میں نہ مل سکتی تھی۔ جب 6 مارچ کو سیالکوٹ اور لاہور کے واقعات کے متعلق مبالغہ آمیز افواہیں پھیلیں اور یہ اطلاع موصول ہوئی کہ حکومت پنجاب نے مطالبات منظور کر لئے ہیں۔ اور کراچی کو اس منظوری کی اطلاع دے دی ہے۔ تو صورت حالات بے حد نازک ہو گئی۔ فوری نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا۔ حکومت نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں چنانچہ جلوس زیادہ جارحانہ ہو گئے۔ ان کی تعداد بھی بڑھ گئی اور ان کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا۔

6 مارچ کو لیاقت باغ میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ ایک ہجوم نے جلسے کے بعد منتشر ہو کر مری روڈ کا رخ کیا۔ اور احمدیوں کی ایک مسجد کو اور ایک چھوٹی موٹر کار کو آگ لگادی اسی شام کو کچھ دیر بعد لوٹ مار اور آتش زنی کے مزید واقعات بھی رونما ہوئے۔ احمدیہ کمرشل کالج' نور آرٹ پریس اور قاک ریسٹوران شہر کے مختلف حصوں میں واقعہ تھے لیکن لوگ زبردستی ان میں گھس گے اور انہوں نے مختلف اشیا کو لوٹنے' جلانے اور تباہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک غیر احمدی نوجوان نور آرٹ پریس میں ملازم تھا۔ اس کو احمدی سمجھ کر چھرا مارا گیا۔ اور وہ اسی زخم کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔ جب صورت حالات سخت خطرناک ہو گئی۔ تو 7 مارچ کو فوج طلب کر لی گئی اس دن تھانہ گولڑہ اور تھانہ سنگجانی کے علاقوں میں ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے گئے۔ شہر کے موزوں اور اہم مقامات پر فوج متعین کر دی گئی۔

8 مارچ کو گورنمنٹ کالج راولپنڈی کے ایک کیمونسٹ طالب علم مسعود ملک اور مولوی عبدالقدوس پونچھی کی سرکردگی میں ایک غضبناک ہجوم پولیس کوتوالی کے سامنے جمع ہو گیا۔ اور خشت باری کرنے لگا۔ سٹی مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ جس سے ایک حلوائی ہلاک ہو گیا۔ اور چھ مجروح ہوئے اس کے بعد 144 کے ماتحت حکم صادر کیا گیا۔ جس کی رو سے جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے اور رات کے وقت کرفیو عائد کر دیا گیا۔ 239 اشخاص کو کرفیو کی پابندیاں توڑنے کی پاداش میں سزائیں دی گئیں۔ اس کے بعد شورش کی تنظیم کرنے والوں نے جامع مسجد میں پناہ لی۔ جہاں سے وہ رضاکاروں کو گرفتاری کے لئے بھیجتے رہے ایک ہزار تینتیس رضاکار گرفتار کئے گئے۔ اور ان کے خلاف زیر دفعہ 188 تعزیرات پاکستان مقدمات دائر کئے گئے۔ یہ سب سزایاب ہوئے سوائے ان چونسٹھ اشخاص کے جنہوں نے معافی مانگ لی اور رہا کر دیئے گئے۔

شورش کی نوعیت کی وجہ سے پولیس اور فوج کے ادنیٰ ملازمین کے حوصلے اور وفاداری پر اثر پڑنے لگا مسلم لیگ کے اکثر لیڈر اور مقامی ایم ایل اے کہیں روپوش ہو گئے اور انہوں نے عوام کا سامنا کرنے سے انکار کر دیا۔ حقیقت میں وہ دو رخی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ بظاہر حکام کے حامی تھے۔ لیکن اندرونی طور پر شورش کی تائید و اعانت کر رہے تھے۔ پورے ضلع میں ایک مولوی بھی ایسا نہ تھا۔ جو شورش کی حمایت نہ کر رہا ہو جو مولوی گرفتار کئے گئے ان میں عارف اللہ شاہ' محمد مسکین'

محمد اسماعیل زاہدی اور عبدالحنان شامل تھے۔ اور یہ تمام آل پارٹیز مسلم کنونشن کے ممبر تھے۔
نواحی اضلاع سے بھی کثیر التعداد لوگ شورش میں حصہ لینے کے لئے آ گئے۔ اطلاع موصول ہوئی کہ ضلع ہزارہ سے دو ہزار پٹھان راولپنڈی کی طرف آ رہے ہیں۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پیر صاحب گولڑہ شریف کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان لوگوں کو واپس چلے جانے کی ہدایت دے دیں۔ اسی طرح ایک کہن سال مگر مقبول عام مولوی محمد اسحاق مانسہروی بھی تحریک کی قیادت کے لئے نکل آئے۔ لیکن حکام ضلع ان کو سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو گئے بلکہ ان سے ایک تحریری اپیل جاری کرائی کہ لوگ لاقانونی اور بد نظمی پیدا کرنے سے پرہیز کریں۔
اس ضلع میں شورش مارچ کے تیسرے ہفتے میں ہو گئی۔

لائل پور

یہ ضلع احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ ان میں سے اکثر جالندھر' گورداسپور' ہوشیار پور' لدھیانہ اور امرتسر کے اضلاع سے آئے ہیں۔ اور یہی اضلاع بہت سے آباد کاروں کے اصلی وطن ہیں۔ جنوری 1953ء تک اس ضلع میں بھی احراری احمدی نزاع کی کیفیت دوسرے اضلاع ہی کی مانند تھی۔ یکم دسمبر کو یوم میلاد النبیؐ کے موقع پر احراریوں نے ایسے جھنڈے بلند کئے جن پر یہ دو مطالبات لکھے تھے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے اور چودھری ظفر اللہ خان کابینہ سے برطرف کئے جائیں۔ اس کے بعد یہ باقاعدہ معمول ہو گیا کہ قبل نماز اور بعد نماز کی تقریروں میں یہی مطالبات دہرائے جانے لگے۔ تقریریں نہ صرف احمدیوں کے بلکہ حکومت کے بھی خلاف تھیں۔ جڑانوالہ کے ایک جلسہ عام میں مولوی فیروز الدین' حافظ عبدالقدیر' مولوی عنایت اللہ مجاہد' مولوی میرداد اور مولوی عبدالرحیم نے تقریریں کیں۔ جن میں مطالبات دہرائے۔ اسی قسم کے جلسے لائل پور' سمندری' ٹوبہ ٹیک سنگھ' تاندلیانوالہ اور گوجرہ میں منعقد ہوئے۔ اس دوران میں رضاکار برابر بھرتی کئے جاتے رہے جو قرآن پر حلف اٹھاتے تھے۔ اور اپنے خون سے ڈائرکٹ ایکشن کے عہدنامے پر دستخط کرتے تھے۔ تحریک کے لئے چندہ آسانی سے جمع ہو رہا تھا۔ رضاکاروں کی تعداد نو ہزار تک اور فراہم شدہ سرمائے کی مقدار تیس ہزار روپے تک پہنچ گئی تھی۔

اس تحریک کو بہت سے مسلم لیگیوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ حقیقت میں لیگ کے بہت سے کونسلر جماعت احرار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس تحریک کی حمایت میں عوام پر اثر ڈال رہے تھے۔

لائل پور کے غلام نبی جانباز، ناندلیانوالہ کے قاضی محمد حسین اور لائل پور کے مولوی عبید اللہ 27 فروری کو صوبائی حکومت کی ہدایت کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے۔ یکم مارچ کو جامع مسجد سے ایک جلوس پندرہ رضاکاروں کے اس دستے کی مشایعت کے لئے ریلوے سٹیشن کو روانہ ہوا جو مولوی یوسف خطیب جامع مسجد کی سرکردگی میں کراچی جا رہا تھا۔ کوئی گرفتاری نہ کی گئی کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لاہور سے ٹیلیفون پر ہدایات موصول ہوئی تھیں کہ کراچی جانے والے رضاکاروں کو گرفتار نہ کیا جائے۔ دوسرے دن صاحبزادہ افتخار الحق نے ریلوے سٹیشن لائل پور کے سامنے ایک نہایت اشتعال انگیز تقریر کی۔ وہ ایک سو رضاکاروں کو لے کر روانہ ہو رہے تھے اور تقریباً چھ ہزار کا ایک ہجوم ان کو ایک جلوس کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر لے گیا تھا۔ وہ سالاروالہ ریلوے سٹیشن پر اتار لئے گئے اور گرفتار کر لئے گئے۔ 3 مارچ کو زیر دفعہ 144 ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کر کے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود جب سیالکوٹ میں گولی چلنے کی خبر یہاں پہنچی۔ تو چار پانچ ہزار انسانوں کا ایک جلوس جامع مسجد سے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کو روانہ ہوا۔ ابھی وہ اپنی منزل مقصود پر نہیں پہنچا تھا کہ 13 آدمی گرفتار کر لیے گئے اور جلوس منتشر کر دیا گیا۔ زراعتی کالج بند ہو گیا اور دیہات سے رضاکار دھڑا دھڑ شہر میں آنے لگے۔ اور شام کے وقت ڈپٹی کمشنر نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا۔ جس میں ضلعی مسلم لیگ اور سٹی مسلم لیگ کے صدر بھی شامل ہوئے۔ ان حضرات کا رویہ ہرگز تعاون کی طرف مائل نہ تھا۔ بلکہ آخر الذکر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میرا رویہ صدر صوبائی مسلم لیگ سے ملاقات کرنے کے بعد معین ہوا ہے جنہیں کچھ مدت پہلے میں لاہور میں مل آیا ہوں۔

4 مارچ کو شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ جامع مسجد میں سات ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ جس میں بہت سے مولویوں نے تقریریں کر کے سیالکوٹ میں گولی چلانے کی مذمت کی۔ جس کے بعد تین الگ الگ جلوس روانہ ہوئے جو بالآخر باہم مخلوط ہو گئے۔ اور ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر گئے وہاں انہوں نے اپنے مطالبات دہرائے۔ اور اپنے آپ کو گرفتاری

کے لئے پیش کیا لیکن ڈپٹی کمشنر نے دانائی سے کام لے کر اس جلوس کا رخ بدل دیا۔ بلکہ جیل تک خود اس کی رہنمائی کی۔ جہاں پہنچ کر جلوس کے لیڈر اور 124 دوسرے اشخاص گرفتار کر لئے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی جلوس کے ساتھ تھے۔ جب ڈپٹی کمشنر نے ہوم سیکرٹری سے فوج مہیا کرنے کی درخواست کی تو 4 اور 5 کی نہ کی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج کو گولی چلانے کا حکم دیا تین آدمی مارے گئے۔ اور ایک زخمی ہوا۔

کچھ احراری رضاکار گوجرانوالہ سے ایک ٹرک میں آئے۔ جس میں مائیکروفون لگا ہوا تھا۔ یہاں وہ گرفتاری سے بچ کر نکل گئے اور جھنگ کو چل دیئے۔ چنانچہ وہ وہاں گرفتار کئے گئے۔ یہ اپنے ساتھ تین ریوالور، کافی گولہ بارود اور تیس ہزار روپیہ نقد لئے جا رہے تھے۔

اسی دن مارچ کے وقت ہجوم نے شہر کے اندرونی ٹرانسمیشن سسٹم کے تار کاٹ ڈالے۔

9 مارچ کو پورے ایک دن کا کرفیو عائد کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود زراعتی کالج کے طلبہ نے ایک لمبا جلوس نکال لیا۔ رضاکار دیہات سے برابر شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک سو بیس جامع مسجد میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ شام کے وقت ڈپٹی کمشنر نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا۔ جس میں ضلع مسلم لیگ کے صدر نے محض مجلس عمل کے نمائندے کا پارٹ ادا کیا۔

10 مارچ کو چیف منسٹر کی دوسری اپیل آ گئی۔ جس میں شورش پسندوں کے خلاف مضبوط کارروائی کی ہدایت دی گئی تھی، اس کا اثر اچھا ہوا۔ اس لئے کہ حکام ضلع کو اس سے واضح ہدایت حاصل ہوئی۔ چنانچہ تحریک ٹھنڈی پڑنے لگی۔ 17 مارچ کو جامع مسجد سے رضاکاروں کا ایک جلوس نکلا۔ 19 مارچ کو متولی کی مدد سے مسجد خالی کرالی گئی۔ اور 20 مارچ کو ضلع کی حالت پھر اپنے معمول پر آ گئی۔

اس تمام دوران میں کسی احمدی کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ نہ شہر میں اور نہ صنعتی رقبے میں کسی جائداد کی توڑ پھوڑ کی گئی۔ پرائیویٹ طور پر گولی چلانے کے صرف دو واقعات ہوئے دونوں میں احمدیوں نے غلط فہمی کے ماتحت گولی چلادی تھی۔ اور دونوں موقعوں پر بعض بچے زخمی ہوئے۔

ضلع کے جن دوسرے قصبوں پر شورش کا اثر ہوا۔ وہ یہ تھے: چک جھمرا، جڑانوالہ، ڈجکوٹ، سمندری، تاندلیانوالہ، گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کمالیہ۔ لیکن ان مقامات پر قوت کے استعمال کی ہرگز ضرورت نہیں پڑی۔ اور احمدیوں کے جان ومال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔
شورش پسندوں سے جو سرمایہ چھینا گیا۔ اس کی مقدار چار ہزار دو سو تیئس روپے دو آنے تین پائی تھی۔

منٹگمری

منٹگمری بھی احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ کیونکہ (1) بہت سے احراری یہاں آباد ہو گئے ہیں (2) احمدیوں کے خلاف تحریک کے ذمہ داروں اور احراریوں کے خلاف بہت سے مقدمات اسی ضلع میں دائر ہوئے (3) احراری یہاں ایک ادارہ چلا رہے ہیں جس کا نام جامع رشیدیہ ہے اور یہ ادارہ احراریوں کی مذہبی سیاسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس ضلع کے پانچ بڑے بڑے احراری یہ ہیں۔ مفتی ضیاالحسن (احراری لیڈر مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بھتیجا) جو منٹگمری میں آباد ہو گیا ہے، مولوی حبیب اللہ، مولوی لطف اللہ اور مولوی عبداللہ تینوں بھائی جو منٹگمری میں جامع رشیدیہ کے بانی ہیں۔ اور مولوی بشیر احمد رضوانی جو اوکاڑے میں آباد ہو گیا ہے۔
یہاں جو واقعات فسادات سے پہلے یا ان کے دوران میں رونما ہوئے۔ ان کی کہانی اس جامع تحریری بیان میں درج ہے جو ان مقامات پر پیش آئے۔ احراریوں اور احمدیوں کی ایک دوسرے کے خلاف تقریریں۔ جب آل پارٹیز مسلم کنونشن نے جولائی 1952ء میں مطالبات مرتب کر لئے اس کے بعد مسجدوں سے احمدیوں کے خلاف پر زور پروپیگنڈا۔ سرائے کی فراہمی اور ڈائرکٹ ایکشن کے لئے رضاکاروں کی بھرتی اور 27 فروری کی گرفتاریوں کے بعد عام جلسے اور جلوس اور زیر دفعہ 7 اضافہ فوجداری یا زیر دفعہ 3 پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتاریاں۔ جماعت اسلامی کے مقامی ارکان اور دوسرے مولوی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور مسجدیں رضاکاروں کا ہیڈ کوارٹر بنا دی گئیں مختلف جماعتوں کے اشخاص نے جن میں مجلس احرار، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ والے بھی شامل ہیں۔ مظاہروں میں سرگرم حصہ لیا۔ ان اشخاص کے نام سپرنٹنڈنٹ پولیس کے تحریری بیان کے ساتھ بطور

ضمیمہ مندرج ہیں۔ بھرتی ہونے والے رضاکاروں کی تعداد منٹگمری میں دو ہزار' اوکاڑہ میں ڈیڑھ ہزار' عارف والا میں سات سو اور چیچاوطنی میں دو سو تھی۔

مولوی لطف اللہ اور حبیب اللہ کی گرفتاری کے احکام صوبائی حکومت کی طرف سے 27 فروری کو موصول ہوئے آخرالذکر اس وقت بھی ہائیکورٹ کے حکم کے ماتحت توہین عدالت کے جرم میں سزائے قید کاٹ رہا تھا۔ حکام ضلع مزید گرفتاریاں بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے مفتی ضیالحسن اور مولوی عبداللہ اور مولوی عبداللہ ثانی کو گرفتار کرنے کی اجازت حکومت سے حاصل کرلی تھی۔ 2 مارچ کو اسے ڈی آئی جی کی طرف سے یہ ہدایت موصول ہوئی کہ کراچی جانے والے رضاکاروں کو گرفتار نہ کیا جائے۔

چیف منسٹر کی اپیل مورخہ 6 مارچ کا اثر یہاں بھی وہی ہوا۔ جو دوسرے مقامات پر ہوا تھا۔ یعنی شورش کو مزید تقویت پہنچ گئی۔

اس ضلع میں کسی قدر اہمیت کے واقعات صرف وہ تھے۔ جو اوکاڑہ میں پیش آئے۔ 6 مارچ کو تین ہزار کا ایک ہجوم ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ اور اس نے ڈاؤن پاکستان میل کو تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ ہجوم نے ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ ٹرین کو روکنے والی ویکم کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ اور مسافر عورتوں کو بے آبرو کیا۔ 8 مارچ کو اوکاڑہ کے قریب ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیئے گئے۔ 3 اپریل کو جامع مسجد میں چند آتش انگیز تقریروں کے بعد عورتوں کا ایک جلوس نکالا۔ جو کچھ کتبے اور جھنڈے اٹھائے ہوئے تھیں۔ پولیس نے کتبے چھیننے کی کوشش کی۔ جس پر پانسوں آدمیوں کا ایک پر غیظ ہجوم پولیس پر پل پڑا' پولیس اس ہجوم کو پیچھے ہٹا رہی تھی کہ ستر سال کا ایک بوڑھا آدمی زخمی ہوا۔ اور پھر ہسپتال میں فوت ہو گیا۔ 8 مارچ کا ایک اور واقعہ بھی ہے اگرچہ اس کا ذکر کسی سرکاری بیان میں موجود نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کے باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کہ حافظ محمد بخش سیکرٹری جماعت احمدیہ چک 4-12 (نزد اوکاڑہ) اور ان کے کنبے کے اشخاص کو جن میں ایک بی اے اور دوسرا بی اے ایل ایل بی ہے۔ مجبور کیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ اور تحریک احمدیہ کے بانی کو گالیاں دیں پھر چار پانچ ہزار کا ایک ہجوم ان کو ان کے گاؤں سے جامع ملیہ اوکاڑہ میں لایا۔ جہاں وہ مولوی ضیاالدین اور مولوی معین الدین کے سامنے پیش کئے گئے اور ان سے کہا گیا کہ ان مولویوں

کے سامنے اپنے عقائد سے منحرف ہونے کا اعلان کریں۔
سرغنوں کو آسانی سے گرفتار کرنے کے لئے 14 مارچ کو اوکاڑہ میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کیا گیا۔ اس کے بعد 17 مارچ کو منٹگمری میں ڈھائی بجے بعد دوپہر سے 6 بجے صبح تک کرفیو عائد رکھا گیا۔
13 مارچ کو منٹگمری اور اوکاڑہ میں 17 دن کے لئے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے۔
اوکاڑہ میں 3 اپریل کا واقعہ پیش آنے کے بعد ضلع کے حالات پھر اپنے معمول پر آ گئے۔

جسٹس منیر رپورٹ کے نتائج

اب پوری صورت حالات پر تبصرہ کرنا مناسب ہے۔
ہر شخص اس پر متفق تھا کہ احراری ایک مخالف حکومت گروہ ہے۔ یہ لوگ قیام پاکستان کے مخالف تھے اور سردار عبدالرب نشتر کا خیال بھی یہی ہے کہ وہ اپنے اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کی فکر میں ہیں۔ 1950ء میں اور پھر 1952ء میں مسٹر انور علی نے جو اس زمانے میں ڈی آئی جی' سی آئی ڈی تھے' پرزور سفارش کی کہ ان کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے مسٹر قربان علی خاں نے بار بار پرزور اور پیشگویانہ یادداشتیں لکھیں اور عظمت کے امکانی نتائج سے آگاہ کیا۔ ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے۔ ایک مکروہ شے دوسری مکروہ شے کی باعث ہوتی ہے لیکن جب کبھی کوئی کانفرنس ہوئی یا تو ان لوگوں کو اپنی پرزور رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کر لیا گیا یا سرکاری اخلاق نے انہیں احتجاج سے باز رکھا لہٰذا مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ جو فیصلے فائلوں میں درج ہیں ان پر ہر شخص متفق تھا اور حکام متعلقہ نے اس بات کی کبھی تردید نہیں کی لہٰذا ہماری رائے یہ ہونی چاہئے کہ ذمہ داری مشترک تھی گو ہمارا احساس اس سے مختلف ہے مزید براں ہمارا احساس یہ بھی ہے کہ احراریوں سے تو ایسا برتاؤ کیا گیا گویا وہ خاندان کے افراد ہیں اور احمدیوں کو اجنبی سمجھا گیا۔ احراریوں کا رویہ اس بچے کا سا تھا جس کو اس کا باپ کسی اجنبی کو پیٹنے پر سزا کی دھمکی دیتا ہے اور وہ بچہ یہ جان کر کہ اسے سزا نہ دی جائے گی اجنبی کو پھر پیٹنے لگتا ہے۔ اس کے بعد چونکہ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں اس لئے باپ محض پریشان ہو کر بیٹے کو مارتا ہے لیکن نرمی سے تاکہ اسے چوٹ نہ لگے۔
چونکہ مرکزی حکومت مسلسل دریافت حال کر رہی تھی اور سی آئی ڈی کی یادداشتیں انبار در

انبار جمع ہو رہی تھیں اس لئے 25 مئی 1953ء کو ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ احراریوں اور احمدیوں کے تمام جلسے ممنوع قرار دیئے جائیں۔ یہ اقدام بہت خوب تھا لیکن 5 جولائی تک اس کو کاٹ چھانٹ کر بالکل ہی نیست و نابود کر دیا گیا' حکم امتناعی کی خلاف ورزی میں جلوس نکلتے ہیں تو نکلنے دو' جلسے ہوتے ہیں تو ہونے دو' احراریوں کے سوا کسی کو گرفتار نہ کرو' کوئی احراری گرفتار نہ کیا جائے' صرف ممتاز احراری گرفتار کئے جائیں اور اگر کوئی ممتاز احراری کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو اس کی جماعت نے منعقد نہ کیا ہو تو اسے حکومت سے استصواب کئے بغیر گرفتار نہ کیا جائے۔

اور حکام ضلع نے قدرتی طور پر اس میں ایک چوتھی ہدایت کا اضافہ کر لیا حکومت سے استصواب کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ استصواب کرنے میں دیر لگتی ہے۔ آخر حکومت کو پولیس کے سولہ تھانوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور پھر مہاجرین اور استقبال معززین کو بھی مزید دو تھانے ہی سمجھنا چاہئے یہ کیس ایک کانفرنس میں پیش کرنا ہو گا لیکن اس وقت جب سات آٹھ اسی قسم کی مزید فائلیں جمع ہو جائیں پھر تین مہینے کے بعد تم سنتے ہو کہ عبداللہ اور نارائن صرف ادنیٰ قسم کے لوگ ہیں ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہ ہو گا۔ لیکن اگر عدالتی کارروائی کی منظوری بھی دے دی گئی تو تین مہینے گزارنے کے بعد اس کی امتناعی وقعت کیا رہ جائے گی؟

اگرچہ 5 جولائی کے فیصلے اس وقت کئے گئے تھے جب مسٹر دولتانہ نتھیا گلی میں تھے لیکن اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ ان کے جانے سے پہلے ان فیصلوں کے متعلق ان سے بات چیت کی جا چکی تھی۔ ہوم سیکرٹری نے ان سے ٹیلی فون کا رابطہ بھی برابر قائم رکھا تھا۔

جہاں ایک طرف افسروں پر یہ ظاہر کیا گیا کہ ان فیصلوں سے احراریوں کو باقی قوم سے منقطع کرنا مقصود ہے وہاں دوسری طرف احراریوں کو اس امر کا موقع دے دیا گیا کہ وہ 13 جولائی کو کنونشن منعقد کر کے تمام مسلم جماعتوں کے علما سے اتحاد کر لیں اس چال سے احرار نے جمہور کے ایک بہت بڑے طبقے کی ہمدردیاں حاصل کر لیں کیونکہ عوام احرار کی نسبت علما کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

جب احراریوں نے دیکھا کہ ان کے جلسے ممنوع کئے جا چکے ہیں اور بعض احراریوں کے خلاف

مقدمات بھی دائر ہو چکے ہیں تو انہوں نے ایک ٹکا دے کر اپنی آزادی خرید لی انہوں نے ایک بیان جاری کیا کہ نہ انہوں نے کبھی آج تک تشدد کی تلقین کی ہے' نہ آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں حکومت کو معلوم تھا کہ انہوں نے تشدد کی تبلیغ کی ہے یا کم از کم ان کی تقریروں کا اثر یہی ہوا ہے لیکن صرف پندرہ روز پیشتر جب مسٹر انور علی نے ان سے معافی مانگنے کو کہا تھا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا حکومت کو خوب معلوم ہے کہ ایک صحیح قسم کا معافی نامہ کیونکر حاصل کیا جاتا ہے چنانچہ 28 فروری کو مولانا اختر علی خاں سے ایسا معافی نامہ حاصل کر ہی لیا تھا لیکن احرار کے معاملے میں ایک ایسا بیان جس سے ان کی عزت اور ان کے اعتبار میں ذرہ بھر کمی بھی نہ ہوتی تھی' بہت بڑی کامیابی قرار دیا گیا اور ان کو اجازت دے دی گئی کہ وہ شوق سے تقریریں کریں' وزیر خارجہ کو گالیاں دیں' وزیر اعظم کو رسوا کریں اور شائستگی کے خلاف الفاظ استعمال کریں اس تمام دوران میں مسٹر دولتانہ کو ان کے افسر بار بار یاد دلاتے رہے کہ احرار اپنے قبول و قرار کی پابندی نہیں کر رہے ہیں لیکن ان افسروں نے خود بھی کسی کارروائی کی تجویز پیش نہ کی یا تو انہیں علم تھا کہ ان کی یادداشتوں کا کوئی اثر نہیں یا انہیں یادداشتیں لکھنے کی عادت پڑ گئی تھی جب متعدد فائلیں جمع ہو گئیں تو ایک پالیسی کانفرنس کی تجویز ہوئی اور 24 دسمبر 1952ء کو فیصلہ کیا گیا کہ عام قانون کا احترام کیا جائے یہ بات تمسخر سے کم نہیں معلوم ہوتی کہ اب تک حکومت پنجاب اس کی وزارت قانون و انتظام اور ان کی سول اور پولیس سیکرٹریٹ کو معلوم ہی نہ تھا کہ عام قانون کا احترام ضروری ہے لیکن اس وقت تک افسروں کی ذکاوت حس اس قدر مردہ ہو چکی تھی کہ ان کے نزدیک عام قانون کی خلاف ورزی کی سزا میں بھی محض تنبیہ کافی تھی۔

مرکزی حکومت نے پالیسی کی ایک چٹھی ستمبر 1951ء میں اور دوسری جولائی 1952ء میں جاری کی اور صوبائی حکومت پر یہ واضح کر دیا کہ جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دیا جائے لیکن صوبائی حکام نے اپنی یادداشتوں میں اس امر پر زور دیا کہ مطالبات کے متعلق فیصلہ مرکز کا کام ہے اور جب تک ان کے موافق یا مخالف فیصلہ نہ ہو گا قانون و انتظام کی صورت حالات بہتر نہ ہو گی۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ مرکز کسی حالت میں بھی مطالبات کو منظور نہیں کر سکتا اور اگر کوئی فیصلہ ہو گا بھی تو وہ نامنظوری ہی کا فیصلہ ہو گا لیکن وہ مصر رہے کہ کوئی فیصلہ ضروری ہونا چاہئے اور مرکز جس کے نمائندہ خواجہ ناظم

الدین تھے کھلم کھلا یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ مطالبات کو مسترد کر رہا ہے کیونکہ خواجہ صاحب کے نزدیک ایسے فیصلے سے ان کا علماء سے تصادم ہو جائے گا اور خواجہ صاحب علماء کی طرف نہایت گہرا میلان رکھتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ مطالبات بغیر کسی مذہبی احتیاط کے 'بغیر امن عامہ کو خطرے میں ڈالے اور بغیر حسیات عامہ کو صدمہ پہنچائے مسترد کئے جا سکتے تھے لیکن ہمارے نزدیک قانون و انتظام کی صورت حالات کے مقاصد کے لئے ان کا جواب دینا بالکل ضروری نہ تھا وہ صورت حالات تو ایک سادہ حکم امتناعی کے نفاذ ہی سے بہت بہتر ہو گئی تھی (گو وہ حکم بہت ناکافی تھا) لیکن جب جولائی 1952ء کے بعد احرار و علماء کے ہر قول و فعل کی طرف سے کامل بے پروائی کا رویہ اختیار کر لیا گیا تو وہ صورت حالات پھر بگڑتی چلی گئی بلکہ اس کے برعکس چیف منسٹر کی ان تقریروں کی وجہ سے یہ بگاڑ اور بھی زیادہ ہو گیا جن میں انہوں نے علی الاعلان یہ خیال ظاہر کیا کہ احمدی مسلمان نہیں ہیں۔

اخبارات نے یقیناً ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی حوصلہ افزائی سے شورش کی آگ کو ہوا دی اور ہم ڈاکٹر قریشی کے اس خیال سے متفق ہیں کہ مسٹر دولتانہ ہرگز اس امر سے بے خبر نہ ہو سکتے تھے کہ اخبارات کیا کر رہے ہیں اردو کے چار اخباروں کو ان کے ہزاروں پرچوں کے عوض بڑی بڑی رقمیں دی گئیں اور وہ پرچے بھی شاید خریدے نہ گئے اور یہ سب کچھ ایک پرانی پالیسی کی تعمیل میں کیا گیا کہ حکومت کی حمایت کرنے والے اخباروں کی سرپرستی کی جائے اور اگرچہ یہی اخبارات سب سے زیادہ شورش انگیزی کر رہے تھے لیکن جولائی 1952ء میں ان کے معاہدوں کی تجدید کر دی گئی اور مسٹر دولتانہ کو اس کا علم تھا دو لاکھ روپے کی رقم جو اسمبلی نے ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لئے منظور کی تھی مسٹر دولتانہ کے احکام کے ماتحت ان چار اخباروں کی خریداری کے لئے منتقل کر لی گئی اور کہا گیا کہ اس سکیم کو خفیہ رکھا جائے ڈائریکٹر نے نہایت خیرہ چشمی سے ہمارے سامنے بیان کیا کہ یہ سکیم خواندگی کو ترقی دینے کے لئے نہیں بلکہ خاص قسم کے اخباروں کی امداد کے لئے وضع کی گئی تھی "زمیندار" باوجود اس امر کے کہ وہ جولائی 1952ء کے بعد بھی جب ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے شکایت کی تھی برابر نفرت کی تلقین و اشاعت کرتا رہا گویا مامور من اللہ سمجھا جاتا رہا اور اس کے خلاف اقدام اس وقت تک ملتوی ہوتا رہا جب آخر اس التوا کی کوئی گنجائش نہ رہی کیونکہ مرکز نے سخت شکایت کی تھی

احراریوں کے آرگن "آزاد" کی طرف مرکز نے بار بار صوبائی حکومت کی توجہ دلائی اور صوبائی حکومت نے ہر دفعہ محض تنبیہہ پر اکتفا کیا۔

مجلس عمل کے چیلنج کو دونوں میں سے کسی حکومت نے بھی سنجیدگی سے قابل توجہ نہ سمجھا۔ خواجہ ناظم الدین آخری لمحے تک اسی امید میں رہے کہ غیب سے کوئی اچھا سامان ہو جائے گا اور صوبائی حکومت ------- کہ شورش کا آغاز کراچی میں ہوگا۔

آخر کار جب الٹی میٹم رد کر دیا گیا تو پوری صورت حال کو بالکل تھیٹر کے ایک عام پر امن تماشے کی طرح سمجھا گیا جس میں مطمئن سامعین کی دلچسپی کے لئے سٹیج پر جلوس نکالے اور نعرے لگا دیئے جا رہے ہوں۔ یہ لاہور میں جلوس قریب قریب روزانہ نکلتے ہیں اور کوئی شخص ان کی پروا بھی نہیں کرتا، جرگے بہت ہو رہے تھے اور کارروائی بالکل مفقود تھی، پولیس بھی موجود تھی اور فوج بھی موجود تھی، اور جیسا کہ ایک افسر نے کہا ہر شخص صورت حالات کے متعلق گہرے غور و خوض میں مصروف تھا اور ہر شخص کو معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہیئے ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ فوج خاصا کام انجام دے سکتی تھی لیکن کسی یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔

"بعض کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا دوسرے کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا یہ لوگ یوں ہی قیاس باتیں کرتے ہیں...... تو کہہ دے کہ میرا خدا بہتر جانتا تھا۔" (کہف)

ہمیں یقین واثق ہے کہ اگر احرار کے مسئلے کو سیاسی مصالح سے الگ ہو کر محض قانون و انتظام کا مسئلہ قرار دیا جاتا تو صرف ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس ان کے تدارک کے لئے کافی تھے چنانچہ وہ طاقت جسے انسانی ضمیر کہتے ہیں ہمیں یہ سوال کرنے کی ترغیب دیتی ہے کہ آیا ہمارے سیاسی ارتقاء کے موجودہ مرحلے پر قانون و انتظام کا مسئلہ اس جمہوری "ہم بستر" سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جسے وزارتی حکومت کہتے ہیں اور جس کے سینے پر ہر وقت سیاسی کابوس سوار رہتا ہے۔ لیکن اگر جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ قانون و انتظام کو سیاسی اغراض کے ماتحت کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے کہ کیا ہوگا اور یہاں ہم رپورٹ کو ختم کرتے ہیں۔

(بحوالہ جسٹس منیر احمد عدالتی تحقیقاتی رپورٹ فسادات پنجاب 1953ء)

ضمیمہ

احراری شورش کا سیاسی پس منظر

الحاج خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کی پارلیمنٹ میں تقریر

19 مارچ 1953ء

آنریبل الحاج خواجہ ناظم الدین، وزیر اعظم پاکستان، نے جمعرات 19 مارچ 1953ء کو پاکستان پارلیمنٹ کے بجٹ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے ممتاز علماء نے اگرچہ اس خاص مطالبہ کی حمایت کی تھی، کہ احمدیہ فرقہ کو ایک اقلیتی فرقہ قرار دیا جائے لیکن یہ ممتاز علماء "ڈائریکٹ ایکشن" کی اس تحریک سے علیحدہ رہے جو احراری جماعت کے "نام نہاد" علماء کی حمایت سے مجلس عمل نے شروع کی تھی۔

آزاد پاکستان پارٹی کے ارکان کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا کہ "وہ بے بنیاد اور غیر ذمہ دارانہ بیانات دیتے رہتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات وہ اپنی ان بے تکی اور غیر ذمہ دارانہ تقریروں کے دوران میں سچی بات بھی کہہ جاتے ہیں اور میں اپنے دونوں معزز دوستوں کی اس رائے سے متفق ہوں کہ پنجاب اور کراچی کے ہنگاموں کے پس پشت اقتدار حاصل کرنے کی سیاست کارفرما ہے۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ اس ایوان کے سامنے اور اس ایوان کی وساطت سے جمہور عوام کو بعض حقائق سے روشناس کر دینا چاہئے۔

"اس تحریک کو ایک "مجلس عمل" نے جاری کیا ہے۔ جس کی پشت پناہی نام نہاد علماء کے احراری گروہ نے کی۔ یہ واقعہ ہے کہ علماء کی مختلف جمعیتوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز علماء "ڈائریکٹ ایکشن" کے اس فیصلے سے کاملاً الگ رہے۔ یہ الگ رہنے والے علماء احمدی جماعت کو

اقلیت قرار دینے کے مطالبے سے تو متفق تھے۔ لیکن انہوں نے "ڈائریکٹ ایکشن" کی حمایت نہیں کی۔

"یہ ایک حقیقت ثانیہ ہے لیکن افسوس۔ ہے کہ اس کی کافی اشاعت نہیں کی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس حقیقت کو عام طور پر نشر کیا جاتا تو بعض علماء اور مسجدوں کے امام جنہوں نے اس تحریک میں حصہ لیا ہے۔ اس سے بالکل مجتنب رہتے۔ میرا یہ بیان ایک اخبار کی اس خبر پر مبنی ہے کہ علماء کی جمعیتوں کے ممتاز حضرات کی اکثریت نے مجلس عمل کے ممبر ہونے کے باوجود اس تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ایسی تحریک پاکستان کے مقاصد کے خلاف ہو گی۔ اور اس سے مملکت کے استحکام کو نقصان پہنچے گا۔ ان کا احساس یہ تھا کہ جو طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں' اور جس حکمت عملی کی تائید کی جا رہی ہے وہ اسلام کے نقطہ نگاہ سے بھی غلط ہے۔

"جن لوگوں نے اس تحریک کی رہنمائی کی اور جو اکثریت میں تھے۔ زیادہ تر احراری گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کی سیاسی تاریخ سے یہ ایوان اور جمہور عوام باخبر ہیں۔ لیکن میں ان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہی لوگ اور ان کے نمائندے ہیں۔ جنہوں نے قائداعظمؒ کو (نعوذ باللہ) "کافر اعظم" اور پاکستان کو "پلید ستان" کہا جنہوں نے پاکستان کی شدید مخالفت کی اور قیام پاکستان کے بعد بھی سرحد پار کے ساتھ اپنے روابط قائم رکھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنی حرکات کی وجہ سے کافی ذلیل و بدنام ہو چکے تھے' اور ان کے پیروؤں کی تعداد مفقود ہو چکی تھی' اس لئے انہوں نے دوبارہ سیاسی زندگی میں داخل ہونے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا۔

میں نے اول سے آخر تک انتہائی کوشش کی اور ان لوگوں کو سمجھایا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں وہ پاکستان کے بہترین مفاد کے خلاف ہے۔ اس سے پاکستان کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔ پاکستان کو ناقابل تلافی مضرت پہنچے گی۔ اور اس کا استحکام شدید خطرے میں پڑ جائے گا۔ لیکن چونکہ ان کے پیش نظر کوئی دینی احکام و مصالح نہ تھے بلکہ محض سیاسی مصالح تھے اس لئے وہ "ڈائریکٹ ایکشن" کی مہم چلانے کے عزم پر جمے رہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ نئی فصل کٹنے اور حالات کے درست ہونے سے پہلے ہی انہیں یہ تحریک شروع کر دینی چاہئے۔

میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ (جب تک قطعی ثبوت نہ مل جائیں) میں علماء کی

نیتوں پر حملہ کروں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک احراریوں کا تعلق ہے۔ یہ ایک خالص سیاسی تحریک تھی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر تھی۔ یعنی سیاسی اقتدار کی لڑائی تھی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں نے آخری لمحے تک ان لوگوں کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں میں ایوان اور عوام کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حکومت نے صرف اس وقت کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ جب آرام باغ کے ایک جلسہ عام میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اگلے دن کی صبح کو آٹھ بجے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کا آغاز کر دیا جائے گا۔ میں نے رات کے ایک بجے ایک ضروری اجلاس طلب کیا۔ جس میں صوبوں کی حکومتوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ پنجاب کی نمائندگی وہاں کے وزیروں' انسپکٹر جنرل پولیس اور ہوم سیکرٹری نے کی۔ صوبہ سرحد کے گورنر صاحب اور وزیر اعلیٰ اور سندھ کے گورنر صاحب بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ میں بنگال' بہاولپور اور خیرپور کے وزرائے اعلیٰ کو اس اجلاس میں طلب نہ کر سکا۔ اس لئے کہ وقت بہت تنگ تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ ڈائریکٹ ایکشن کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں تو میں صرف انہی حکام کو طلب کر سکا۔ جو ہوائی جہاز سے کراچی پہنچ سکتے تھے۔ اس اجلاس میں صوبائی حکومتوں کے نمائندوں نے فیصلہ کیا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس تحریک کا مقابلہ کیا جائے اور قانون و انتظام کو قائم رکھنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے۔

میں اس خیال پر پختگی سے قائم ہوں کہ حکومت کے پارلیمنٹری نظام میں اور اسلامی مملکت میں کسی شخص کو اس امر کا حق حاصل نہیں کہ حکومت کو قوت کے ذریعے سے تلپٹ کر دے یا قوت سے کام لے کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ جمہوری نظام حکومت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حکومتیں صرف مسلمہ پارلیمنٹری طریقے ہی سے بدلی جا سکتی ہیں اور جب تک انتخابات ہو رہے ہوں اور جمہور کو اپنے پسندیدہ نمائندے منتخب کرنے کا موقع حاصل رہے۔ جبر و قوت سے کام لے کر حکومت سے اپنی مرضی منوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومت کا پارلیمنٹری نظام ان لوگوں کے ارادے پر مبنی ہے۔ جو کسی خاص وزارت کی حمایت کرتے ہیں اور آئین میں اس امر کے لئے ضوابط موجود ہیں۔ کہ اگر وہ وزارت عوام کا اعتماد کھو دے تو اس کو کس طریقے سے بدلا جائے۔

اب آپ حضرات غور فرمایئے۔ اگر جمہوری نظام حکومت میں ایک دفعہ کسی گروہ کو ڈائریکٹ ایکشن کے ذریعے سے وزارت کو بے دخل کرنے کا موقع دے دیا گیا تو حکومت کا پارلیمنٹری نظام

ہو جائے گا۔ اور ڈکٹیٹری اور فاشزم کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ چونکہ یہ حکومت پارلیمنٹری نظام اور اسلامی مملکت کے وجود پر اعتماد رکھتی ہے۔ اس لئے اس نے محسوس کیا کہ یہ تحریک جمہوریت اور اسلام دونوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں ملک میں بالخصوص پنجاب میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ جو آج ناراض اور تلخ کام ہیں۔ لیکن ایک دن آئے گا۔ جب وہ اس امر کو تسلیم کریں گے کہ اس حکومت نے سینہ سپر ہو کر پاکستان کی سلامتی اور استحکام کو محفوظ رکھا اور مملکت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

جناب والا، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جن لوگوں نے اس تحریک میں حصہ لیا ہے۔ ان میں سے بعض مخلصانہ مذہبی جوش سے سرشار تھے لیکن میں انہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس تحریک کی پشت پناہ تھے اور جو مدت دراز سے اس کا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ انہوں نے غیر اسلامی چالیں اور عیاریاں اختیار کیں۔ اسلام دانستہ دروغ بافی اور جھوٹے پروپیگنڈے کا ہرگز روادار نہیں ہے۔ اس جھوٹے پروپیگنڈے کے علاوہ جو ان لوگوں نے پاکستان کے وزیر خارجہ کے خلاف کیا۔ انہوں نے تو یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کیا کہ میں قادیانی ہو گیا ہوں۔ اور میرے بیٹے نے ایک قادیانی لڑکی سے شادی کی ہے۔ حالانکہ انہیں خود معلوم تھا کہ یہ باتیں قطعاً غلط ہیں۔

میں سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جس حالت میں اسلام "بہتان" کی اجازت نہیں دیتا۔ ایسی بہتان آمیز تحریک اسلامی تحریک کیونکر کہلا سکتی ہے۔ اور پھر ان حرکات کو بھی پیش نظر رکھئے۔ جو اس تحریک کے دوران میں کی گئیں۔

شہری دفاع کے مقاصد کے لئے لوگوں کو جو اسلحہ سپرد کئے گئے اور جو تربیت دی گئی وہ فوج اور پولیس کے خلاف استعمال کی گئی۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ ڈالے گئے۔ سڑکیں توڑ دی گئیں۔ مواصلات کے سلسلے میں خلل ڈالا گیا۔ ٹرینیں روکی گئیں۔ لوکو شیڈ میں انجن بیکار کر دیئے گئے اور ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ ڈالی گئیں۔

اب میں ایوان کے ممبروں کی توجہ ان اقدامات کی نوعیت کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ جن کو میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ یہ حرکات ان مسلمانوں سے ہرگز سرزد نہیں ہو سکتیں۔ جو مذہبی جذبات سے سرشار ہوں۔ یہ کسی ایک سیاسی پارٹی کا کام نہیں۔ بلکہ اس ملک میں بعض اور تخریبی عناصر بھی

موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حالات سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اس تحریک میں بھی داخل ہو گئے۔ انہوں نے بدامنی اور لاقانونی کی حالت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور ان کے پیش نظریہ مقصد بھی تھا کہ اگر ممکن ہو تو مرکزی حکومت کو بے دخل و بے اقتدار کر دیا جائے۔ ایک ایسے صوبے میں جہاں غذائی اجناس کی حالت بے حد سنگین تھی اور جہاں خوراک کے ایک ایک دانے کی ضرورت تھی۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دینا کس قدر خوفناک جرم تھا۔ اس کا اندازہ کر لیجئے۔ ریل کی پٹڑیوں توڑ کر ٹرینوں کی آمد و رفت کو روک دینے کا مطلب ایک ہی ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ ایک عام ابتری پھیلا دینا اور حکومت کو ناکام کر دینا چاہتے تھے۔

جناب والا، میں ایوان کو یقین دلاتا ہوں کہ کراچی میں مرکزی حکومت نے اور صوبجات میں صوبائی حکومتوں نے جو اقدامات کئے۔ وہ ان پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی باقی نہ رہا تھا۔ دو ہی باتیں تھیں یا تو تشدد اور آمریت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جاتا یا اس خطرے کا مقابلہ ڈٹ کر کیا جاتا۔ ہم نے جو کچھ کیا لاقانونی کو روکنے کے لئے کیا۔ جان و مال کی تباہی کو روکنے کے لئے کیا۔ شہریوں کو حملوں سے بچانے کے لئے کیا۔ اس کے سوا ہماری اور کوئی غرض نہ تھی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہم نے صرف اس وقت اقدام کیا۔ جب ہمیں قطعی چیلنج دیا جا چکا تھا۔

جناب عالی! میں امن و آئین کے سلسلہ میں مرکزی حکومت کی ذمہ داری کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں..... ہمارے دستور کے تحت امن و آئین کی ذمہ داری کلی طور سے صوبائی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت صرف مرکزی زیر انتظام علاقوں میں امن و آئین کی ذمہ دار ہے۔

صوبہ کے شہری حکام بدامنی کے موقع پر، حالات پر قابو پانے کے لئے فوجی امداد طلب کر سکتے ہیں۔ بدامنی کے موقع پر جو فوج طلب کی جاتی ہے وہ عموماً شہری حکام کے زیر ہدایات ہوتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ بدامنی کو دبانے کے لئے کس قدر طاقت استعمال کی جائے خود فوج کا کام ہے۔ مگر جب صورت حال شہری حکام کے قابو سے باہر ہو چکی ہو تو فوج کو کلی اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور وہ ہدایات دے سکتی ہے، اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے شہریوں پر مختلف پابندیاں بھی عائد کر سکتی ہے۔ ہمیشہ ایسے مواقع پر اصول یہ ہوتا ہے کہ اگر حالات شہری حکام کے قابو سے باہر ہو چکے ہیں تو

امن قائم کرنے کے لئے شہری نظام میں ان کی مداخلت ناگزیر ہے۔ چنانچہ ایسی حالت میں فوجی حکام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور پھر طاقت کا جواب طاقت سے دیتے ہیں۔ گویا فوج اس خلا کو پر کرتی ہے جو شہری حکام کے 'حالات کا مقابلہ نہ کرسکنے کی بناپر' پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر فوج ایسا نہ کرے تو عام ابتری اور نراج پھیل جاتا ہے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ پورا نظام مملکت ہی پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ مارشل لاء اس صورت حال کو کہتے ہیں جس کے تحت فوج تمام صورت حال کو اپنے قبضہ و اختیار میں لے لے۔ مارشل لاء "اعلان عام" کے ذریعہ معرض وجود میں نہیں آتا بلکہ اس کے ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

جناب والا' مجھے امید ہے کہ جن لوگوں نے اب تک اس تحریک میں حصہ لیا ہے اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ وہ کوئی مذہبی فریضہ بجا لا رہے ہیں' اب اس سے پرہیز کریں گے۔ کیونکہ اب مسئلہ خالص قانون و انتظام کا ہے۔ اب مسئلہ خالصتہ" یہ ہے کہ بعض عناصر نے اپنے ذاتی اغراض اور سیاسی مقاصد کی خاطر لوگوں کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ میری دعا بھی ہے اور استدعا بھی کہ عوام اس امر کو محسوس کرلیں کہ حکومت نے اس معاملے میں جو کچھ کیا ہے' اگر وہ نہ کرتی' تو گویا اپنے فرض کی بجا آوری میں قاصر رہتی۔

جناب والا' آجکل ہم نہایت نازک زمانے سے گزر رہے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں مصیبتیں بھی آیا کرتی ہیں' اور جب مصیبتیں آتی ہیں تو گویا یہ قوموں کی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے گذارش کرتا ہوں کہ قرآن مجید میں بار بار یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ اور مسلسل خوشحالی کی حالت میں نہیں رہتی اور وقتاً" فوقتاً" آزمائش کے دور بھی آتے رہتے ہیں۔ اگر ان موقعوں پر تم ثابت قدم رہتے' اور تم نے صبر سے کام لیا تو انشاء اللہ تم اپنی مشکلات پر غالب آ جاؤ گے۔ اور خوشحالی عود کر آئے گی۔

جناب والا' اللہ کے فضل سے ہمارا مستقبل روشن ہے یہ مشکلات عارضی ہیں اور ہمیں سختیوں کا مقابلہ بہرحال کرنا ہے۔ ایسی سختیاں ہر قوم کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں' کہ مغربی یورپ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بعض قوموں کو اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ مشکلات سے سابقہ پڑا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم محض اس لئے اپنی مشکلات

پر قابو نہ پالیں کہ بعض حضرات پاکستان کے مصائب پر شیطانی مسرت سے بغلیں بجا رہے ہیں۔

میں ایوان کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنی مشکلات پر ضرور قابو پالیں گے۔ ہمارا مستقبل روشن ہے۔ بشرطیکہ ہمارے درمیان اتحاد قائم رہے اور ہمارے تمام اعمال نیک نیتی اور خلوص پر مبنی ہوں۔"

باب 4

اچھوت نسل

بیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں دنیا ایک نئے انقلابی' سائنسی اور ترقی یافتہ اور رواداری پر مبنی انسانی حقوق کے تحفظ کے حامل سماج کی تشکیل کی بنیاد رکھ رہی تھی۔ اسی لمحے پاکستان میں تعصب' انسانیت سوز روایات اور انسانی حقوق کی ایسی تاریخ کا آغاز کیا جا رہا تھا' ایسے حالات پیدا کئے جا رہے تھے کہ پوری انسانی اور جمہوری تاریخ میں کوئی مثال ثانی نہ تھی انسان اور انسانیت کی پامالی کے لئے مذہب کے نام نہاد علمبرداروں جو آزادی سے اب تک "مذہبی قبضہ مافیا" کا روپ دھار چکے تھے اس ملک کے نظام کو اپنے غیر انسانی اصولوں کے تحت چلانے پر مصر تھے اور ہمارے حکمران بھی اپنے حرص اقتدار کی دھن میں ان کے ناجائز مطالبات کو مذہبی اوتار سمجھ کر قبول کرنے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔

30 مئی 1974ء کو ملتان نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ کی اوچھی حرکتوں سے پیدا ہونے والے حالات نے اس وقت ملکی حالات میں ایک ہیجان پیدا کر دیا جب پاکستان کی دوسری نسل اس ملک کی فضاؤں میں جنم لے رہی تھی۔ یہ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ مئی 1974ء کے آخری عشرے میں نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء کا ایک گروپ مطالعاتی دورے پر راولپنڈی جا رہا تھا۔ راستے میں ربوہ کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو بعض طلباء نے ریلوے پلیٹ فارم پر موجود احمدی خواتین جو کہ اپنے مخصوص برقعہ میں ملبوس تھیں انہیں چھیڑ چھاڑ کی اور احمدی عقائد کا مذاق اڑایا جس پر اسٹیشن پر موجود احمدی مردوں اور طلباء میں جھڑپ ہو گئی تاہم ٹرین چل پڑی تو یہ طلباء بھی اس میں سوار ہو کر چلے گئے۔ مگر چند روز بعد 30 مئی کو جب یہی طلباء راولپنڈی سے واپس آئے تو دوبارہ ربوہ اسٹیشن پر انہوں نے

وہی رویہ دہرایا۔ احمدیوں اور ان کی خواتین کو مذاق کا نشانہ بنایا۔ جس پر فریقین میں جھڑپ ہوئی اور طلباء اور احمدی دونوں فریقوں کے افراد زخمی ہوئے۔ طلباء کا یہ گروپ ٹرین سے جب فیصل آباد (لائل پور) پہنچا تو طلباء ریلوے ٹریک پر لیٹ گئے اور احمدیوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ طلباء کے اس احتجاج کی خبر جب تحفظ ختم نبوت فیصل آباد کے رہنماؤں تک پہنچی تو پھر شہر بھر کی مساجد میں احمدیوں کے خلاف پراپیگنڈا شروع ہو گیا۔ شہر میں ہڑتال اور احمدیوں کی املاک پر حملے کئے گئے۔ اگلے روز پورے ملک میں اس مسئلہ پر باقاعدہ ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بھٹو حکومت مخالف "ملا اتحاد" جو کہ پہلے ہی کسی موقع کی تلاش میں اس ایشو کو اٹھا کر عوام میں آ گیا۔ ان ہنگاموں میں احمدیوں کو شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ ربوہ کے واقعہ کے تناظر میں 30 مئی کو ہی لائلپور (فیصل آباد) میں فسادات پھوٹ پڑے۔ مذہبی شدت پسندوں کے ایک جتھے نے شہر میں احمدیوں کی ملکیت دکانوں اور دفاتر کو نذر آتش کر دیا اور پھر چند دنوں میں فسادات نے لاہور، گوجرانوالہ اور اسلام آباد سمیت پورے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جبکہ سندھ اور سرحد میں بھی شدت پسند جنونی مسلمانوں نے احمدیوں کے خلاف تخریبی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ ان فسادات کی بہت کم تفصیلات اخبارات میں شائع ہو سکیں کیونکہ حکومت نے ان واقعات کی رپورٹنگ پر سخت سنسر شپ عائد کر دی تھی کہ الاماں! جبکہ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دو ہفتے کے اندر مسلمان جنونی شدت پسندوں کے ہاتھوں احمدیوں کی سات مساجد نذر آتش ہوئیں۔ 500 کے قریب دکانوں اور گھروں کو لوٹا گیا جبکہ 2000 افراد ان فسادات میں بے گھر ہوئے۔ حکومتی ترجمان نے 22 جون 1974ء کو سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ان فسادات میں 42 افراد ہلاک ہوئے جن میں سے 27 احمدی تھے۔ حالانکہ ہلاک کئے جانے والے احمدیوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔

اپوزیشن کی جماعتوں نے جو کہ حکومت کو ہر قیمت پر کمزور کرنا چاہتی تھیں، ان فسادات کو بہترین موقع سمجھتے ہوئے 6 جون کو احمدی مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپوزیشن نے جماعت احمدیہ کے سربراہ خلیفہ مرزا ناصر احمد کی گرفتاری کا بھی مطالبہ کیا اور اپنے مطالبات کی حمایت میں 14 جون کو پورے ملک میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

اپوزیشن کے اس مطالبے کے جواب میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے 13 جون 1974ء

کے نشری خطاب میں احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے معاملہ کو قومی اسمبلی میں پیش کرنے کا اعلان کرتے ہوئے پیپلزپارٹی کے ارکان کو اپنی مرضی سے حق رائے دہی دینے کا فیصلہ قوم کو سنا دیا۔ بھٹو نے قومی اسمبلی کو اختیار دیا کہ وہ اس معاملہ کو اپنی مرضی سے اسلامی نظریاتی کونسل یا سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے سامنے بھی پیش کر سکے گی۔

30 جون کو حکومتی اعلان میں کہا گیا کہ قومی اسمبلی کو سپیشل کمیٹی میں تبدیل کیا جائے گا جس کا چیئرمین سپیکر ہو گا اور یہ کمیٹی بند کمرے میں یہ فیصلہ کرے گی کہ کسی ایسے شخص کی کیا حیثیت ہو گی جو کہ محمد ﷺ کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتا (نعوذ باللہ)

حکومت پنجاب نے احمدیوں کے مخالف شدت پسند صحافی آغا شورش کاشمیری کو اپنے ہفت روزہ ''چٹان'' میں احمدیوں کے متنازعہ مسئلہ پر شر انگیز مواد کی اشاعت پر تین ماہ کیلئے نظر بند کر دیا۔ آغا شورش 1953ء کے فسادات میں بھی بہت سرگرم رہے تھے۔

30 جون کو قومی اسمبلی جو کہ سپیشل کمیٹی میں تبدیل ہو گئی تھی' نے احمدیوں اور احمدیوں کے مخالف فرقوں کے سکالروں اور مفتیوں سمیت جماعت احمدیہ کے خلیفہ مرزا ناصر احمد کے بیانات بند کمرے میں سنے۔ دو ماہ کی سماعت کے بعد جماعت احمدیہ کو دو فرقوں قادیانی اور لاہوری گروپ میں تقسیم کر کے ان کے عقائد پر غور کیا۔ 7 ستمبر کو قومی اسمبلی اور سینٹ کے علیحدہ علیحدہ اجلاس منعقد کئے گئے جس میں اکثریت کے ساتھ ایک نئی آئینی ترمیم منظور کی گئی۔ اس ترمیم میں احمدیوں کو اقلیت قرار دیتے ہوئے صوبائی اور قومی اسمبلی میں ان کے لئے نشستیں مخصوص کی گئیں۔ ترمیم میں کہا گیا تھا کہ ہر اس شخص کیلئے جو کہ نبی آخر الزماں کے آخری نبی ہونے پر ایمان نہ رکھتا ہو' یا ان کے بعد کسی کو مذہبی مصلح یا محمد ﷺ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرتا ہو' قانونی اور مذہبی حوالے سے مسلمان نہیں۔

اس کے ساتھ ہی ایک قرار داد بھی منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ کوئی بھی مسلمان جو عملی' زبانی یا تحریری طور پر محمد ﷺ کے آخری نبی ہونے کے خلاف پراپیگنڈا کرے گا وہ پینل کوڈ کے تحت قابل سزا ہو گا۔

اس آئینی ترمیم نے براہ راست احمدیوں کو متاثر کیا جو کہ جماعت احمدیہ کے بانی مرزا غلام احمد کو

نبی تسلیم کرتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ پاکستان میں بسنے والی اقلیتیں ہندوؤں' پارسیوں' سکھوں' بودھوں اور عیسائیوں کے حقوق بھی متاثر ہوئے۔ جن سے تعلق رکھنے والے افراد کو آئین میں تحفظ حاصل تھا مگر اب ان کی حالت انتہائی کسمپرسی کی تھی اور ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس قانون کے بعد قدامت پسند مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان شادیوں کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اور بھٹو حکومت نے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے احمدیوں کو اقلیت قرار دے دیا۔ یوں ملک کے "ملا مافیا" کو اس بات کا احساس بھی دلا دیا گیا کہ وہ کس قدر قوت کے حامل ہیں اور ان کی یہ آگہی ملک بھر میں فرقہ واریت کی بنیاد ثابت ہوئی۔

بعد میں آنے والے دنوں میں پاکستان کے ہر حکمران نے ان ملاؤں کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ان کی ناجائز خواہشات کے احترام کو مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے احمدیوں پر ظلم و ستم کا عین ثواب اور عبادت سمجھا۔ جب کہ بھٹو کے فوراً بعد جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے دور میں احمدی کمیونٹی جن حالات کا شکار ہیں ایسے حالات شدید بھارت کے برہمن سماج میں رہنے والے "مسلمان اچھوتوں" کے بھی نہ ہوں اور ایسے مظالم مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجوں کے ہاتھوں بھی رونما نہ ہوئے ہوں جن کا ڈھونڈرا پاکستاں کے حکمران عالمی سطح پر پیٹتے ہیں۔

ضیاء الحق کی تمام تر سرگرمیاں صرف اس مرکزی محفور کے گرد ہی رہتی تھیں کہ کس طرح اس کی آمریت کو محفوظ اور طویل بنایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے محض ذاتی اقتدار کی خاطر ہی قوم کو مختلف لسانی' نسلی' علاقائی اور فرقہ وارانہ گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ قادیانی جماعت کا مسئلہ پاکستانی عوام کے لئے بڑا حساس رہا ہے۔ لاہور کا پہلا مارشل لاء بھی اسی سنگین مسئلے کی پیداوار تھا۔ جب جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس مسئلے کی نزاکت کے پیش نظر قومی اسمبلی کو اس معاملے پر بحث و مباحثے کی دعوت دی اور قومی اسمبلی نے خصوصی کمیٹی کی حیثیت سے قادیانی جماعت کو غیر مسلم قرار دے دیا۔ اس طرح قوم اور علمائے کرام کا یہ دیرینہ مطالبہ پورا ہو گیا کہ قادیانی جماعت کو غیر مسلم قرار دے دیا جائے۔ قومی اسمبلی کے فیصلے کے بعد اس مسئلے کو دوبارہ چھیڑنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کی یہ سیاسی ضرورت تھی کہ وہ اپنے مرد مومن مرد حق ہونے کا ثبوت فراہم کرے۔ چنانچہ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ اچھے اور نیک کام کر کے نیکی پھیلاتے جب

کہ دوسرا یہ کہ وہ آمرانہ اور ظالمانہ اقدامات سے بزعم خویش برائے کے راستے روکتے۔ ضیاء الحق کی بدنصیبی یہ تھی کہ دنیا کا کوئی نیک عمل ان کے مقدر میں تھا ہی نہیں جس کا تعلق خصوصاً مخلوق خدا اور انسان دوستی سے ہو۔

ضیاء الحق نے محض قادیانی جماعت کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے لئے کئی قوانین میں ترامیم کر دیں۔ جن کا واضح مقصد اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا کہ مذہبی منافرت پھیلا کر اپنے اقتدار کو طول دیا جائے۔

ضیاء الحق نے آئین کے آرٹیکل نمبر260 میں ترمیم کر کے مسلم اور غیر مسلم تعریف اس طرح کی۔

(ا) مسلم جو شخص اللہ کی وحدانیت اور رسالت ماب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت پر ایمان رکھتا ہو۔ آپؐ کو آخری نبی مانتا ہو اور آپؐ کے علاوہ کسی بھی شخص کو نبی یا مصلح تسلیم نہ کرتا ہو' وہ مسلم ہے۔

(ب) غیر مسلم جو شخص مسلم نہ ہو یا جس کا تعلق عیسائی' ہندو' سکھ' بدھ یا پارسی فرقوں سے ہو' وہ غیر مسلم ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قادیانی جماعت کو غیر مسلم بنانا خاصا مسلم کام تھا اس لئے کہ مسلمان کی تعریف تو صرف یہ تھی کہ جو شخص توحید و رسالت پر ایمان لے آئے وہ مسلمان ہے۔ یعنی جو شخص بھی کلمہ طیبہ پڑھ لے اور **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** اپنی زبان سے ادا کر دے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے جن باتوں پر ایمان لانا ضرور تھا ان میں توحید رسالت' فرشتوں' آسمانی کتابوں' خیر و شر کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا اور حیات بعد الموت شامل ہیں۔ قادیانی جماعت ان جملہ باتوں پر ایمان رکھتی ہے۔ البتہ وہ ختم نبوت کی قائل نہیں۔ اس لئے ضیاء الحق نے قادیانی جماعت کو اسلام سے خارج کرنے کے لئے لفظ مسلم اور غیر مسلم کے مندرجہ بالا معنی متعین کیے۔ مگر اس مسئلے پر دلچسپ صورتحال اس وقت سامنے آئی جب 1953ء میں فسادات پنجاب کے سلسلے میں تحقیقاتی عدالت نے پاکستان کے نوجید علماء کرام جن میں مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان' مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان' مولانا

ابو الاعلیٰ مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان، غازی سراج الدین منیر صاحب، مفتی محمد ادریس صاحب جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد، حافظ کفایت حسین صاحب ادارہ تحفظ حقوق شیعہ، مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیت العلمائے پاکستان، مولانا محمد علی کاندھلوی دارا لشہابیہ سیالکوٹ، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے پوچھا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟

چنانچہ ان تمام حضرات کی طرف سے جوابات سننے پر عدالت عالیہ نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ

"ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں، پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی کوئی ضرورت ہے۔ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے "مسلمان" کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم دین نے کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے۔"

(بحوالہ رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب 1953ء)

"مسلمان کی تعریف" کے ہی سلسلہ میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کالم روزنامہ جنگ لاہور مورخہ 17 فروری 1984ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"مجھے یاد ہے کہ لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی نے علماء سے مسلمان کی تعریف دریافت کی تو علماء نے آپس میں مشورہ کے بعد کہا تھا کہ ہمیں اس کے لئے کچھ مہلت دیجئے۔" تو جسٹس موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ "آپ کو ڈیڑھ ہزار سال کی مہلت مل چکی ہے اس سے زیادہ مہلت دینا اس عدالت کے اختیار میں نہیں۔"

اگر دیکھا جائے تو جو کچھ اس ایک فقرہ میں کہہ دیا گیا ہے، اسے ضخیم کتاب میں بھی اس خوبصورتی سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم ان تمام حوالوں سے قطع نظر ایک بات طے شدہ ہے کہ احمدیوں کے نزدیک ختم نبوت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا تصور اور عقیدہ اتنا ہی پختہ ہے جتنا کہ خدائے بزرگ و برتر کے وجود کا ہونا ہے مگر جنرل ضیاء الحق نے احمدیوں کے ایشو کو اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے جس بے دردی سے

استعمال کیا اس سے ہٹلر اور سٹالن جیسا ڈکٹیٹر بھی پناہ مانگتا نظر آتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے 18 ستمبر 1980ء کو تعزیرات پاکستان میں ترمیم کر کے دفعہ 298 الف کا اضافہ کر دیا۔ اس قانون کے مطابق جو کوئی شخص تحریری، تقریری یا کسی بھی طرح سے کسی ام المومنین، اہل بیت یا خلفائے راشدین میں سے کسی بھی خلیفہ یا صحابہ کرام کی توہین کرے تو اس کو تین سال قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح 24 اپریل 1984ء کو جنرل ضیاء الحق نے تعزیرات پاکستان میں مزید ترمیم کر کے تعزیرات میں دفعات 298-ب اور 298 ج کا اضافہ کر دیا۔

(1) دفعہ 298 ب:- اگر قادیانی گروپ یا لاہور گروپ کا کوئی بھی شخص (جو اپنے آپ کو احمدی کہلواتا ہو یا اس کا کوئی اور نام ہو) تحریری، تقریری یا کسی اور طرح سے

(الف) کسی شخص کو خلفائے راشدین یا صحابہ کرام کے علاوہ خلیفتہ المسلمین، خلیفتہ المومنین، صحابی یا رضی اللہ عنہ، کے الفاظ سے خطاب کرے۔

(ب) ازدواج مطہرات کے علاوہ کسی خاتون کو ام المومنین کے الفاظ سے پکارے،

(ج) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اہل بیت کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو اہل بیت کہے۔

(د) اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہے تو اس کو تین سال کی سزائے قید دی جا سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو گا۔

(2) اگر قادیانی گروپ یا لاہور گروپ کا کوئی شخص عبادت کی خاطر بلانے کے لئے اذان دیتا ہے یا اس طرح طلب کرنے کو اذان کہتا ہے تو اس کو تین سال تک سزا دی جا سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو گا۔

(3) دفعہ 298 - ج:- اگر قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا کوئی مرد (جو اپنے آپ کو احمدی کہلواتا ہو یا کسی دوسرے نام سے یاد کیا جاتا ہو) اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور اپنے مذہب کو اسلام کا نام دیتا ہو یا اپنے عقائد کی اس طرح تبلیغ کرتا ہو کہ جس سے عام مسلمانوں کے عقائد مجروح ہوتے ہوں تو اس کو تین سال قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو

26 اپریل 1984ء کو پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی دفعہ 24 میں ایک ذیلی دفعہ کا اضافہ کر کے قادیانی جماعت کے لٹریچر کی اشاعت پر پابندی لگادی۔

ضیاء حکومت کے یہ اقدامات سیدھے سادھے لفظوں میں احمدیوں کی آزادی، فکر، ضمیر اور مذہب کو غصب کرنا تھا اور بات یہاں تک ہی نہ رہی بلکہ ایک طرف ریاست کے ذریعے احمدیوں کو دبانے کی کوشش کی گئی بلکہ دوسری طرف ریاست ایسے گروہوں اور تنظیموں کی بھرپور حمایت اور اعانت کرتی رہی جو صرف اور صرف قادیانیوں (احمدیوں) کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ ان گروہوں کی جانب سے احمدیوں کے خلاف ہر ظلم پر حکومت اور ریاست کی جانب سے کبوتر کی طرح آنکھیں موندنے کی پالیسی جاری تھی اور آج حالات یہ ہیں کہ یہی "ملا مافیا" پورے ملک میں ایک دوسرے فرقے پر کافر ہونے کا فتویٰ عائد کر کے قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھے ہوئے اور ریاست کے ہاتھوں بنے ہوئے ان کے دہشت گردی کے نیٹ ورک اس قدر مضبوط اور محفوظ ہیں کہ خود حکومت کی ان کے خفیہ پروگراموں تک رسائی ناممکن ہو چکی ہے۔

ضیاء الحق نے قادیانی جماعت کے خلاف قوانین تو بے شک نافذ کر دیئے تھے لیکن عملاً اس کی کاروائیوں کا مرکز اور محور غیر قانونی سرگرمیوں تک محدود رہا۔ ان کاروائیوں میں مساجد کا گرانا، کلمہ طیبہ کا مٹانا اور قادیانی جماعت کے سرگردہ افراد کا قتل شامل تھا۔ ضیاء الحق پاکستان کی حکومت کے سربراہ تھے۔ ایک مسلمان مملکت کے حکمران کی حیثیت سے اس ملک کے عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ان کی قانونی، اخلاقی، آئینی اور مذہبی ذمہ داری تھی۔ نیز ان کا فرض تھا کہ وہ اس ملک کے تمام شہریوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، کے ساتھ انصاف کرتے اور ان کے حقوق کی حفاظت بھی ان کی ذمہ داری تھی۔ اسلامی تعلیمات میں ایسا کوئی حکم نہیں ملتا جس کے مطابق غیر مسلم آبادی کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دیا جائے یا ان کو اپنی مذہبی عبادت یا رسومات ادا کرنے سے روک دیا جائے۔ اس کے برعکس اسلام مذہبی رواداری اور آزادی کی تعلیم دیتا ہے نیز غیر مسلم آبادی کو تحفظ دینے کا حکم دیتا ہے۔

مساجد کی مسماری

قادیانی جماعت کی بہت سی مساجد کو یا تو مسمار کر دیا گیا یا پھر سر بمہر کر دیا گیا۔ 17 اگست 1986ء کو قادیانی جماعت کے افراد نماز عید ادا کرنے کے لئے مردان کی عید گاہ میں جمع ہوئے۔ پولیس نے تمام افراد کو نماز عید پڑھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا اور عید گاہ کو مسمار کر دیا گیا۔ اسی طرح راہوالی' بھکر' ملتان' گوجرانوالہ اور جھنگ میں قادیانی جماعت کی مساجد کو آگ لگا کر گرا دیا گیا۔ مگر حکومت کی طرف سے مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ جب کہ بعض مقامات پر مقامی حکام کے احکامات کے تحت ان کی موجودگی میں کلمہ طیبہ کو کھرچ کر مٹا دیا گیا۔ مثال کے طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کوئٹہ اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ راولپنڈی کے حکم پر قادیانی جماعت کی مساجد سے کلمہ طیبہ مٹا دیا گیا۔ اس کے علاوہ کوئٹہ' ساہیوال' گجرات اور دیگر مقامات پر مقامی حکام کے احکامات کے تحت قادیانی جماعت کی مساجد کو سر بمہر کر دیا گیا۔

بلا جرم قتل

قادیانی جماعت کے بہت سے افراد کو بغیر کسی جرم یا گناہ کے کھلے مقامات پر دن دہاڑے قتل کر دیا گیا۔ لیکن حکومت کی طرف سے مجرموں کو گرفتار کرنے یا قرار واقعی سزا دینے کے لئے قانونی مشینری کو خاموش کر دیا گیا۔ قتل ہونے والوں میں بعض افراد بڑی اہمیت کے حامل تھے جن میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

(1) پروفیسر عقیل بن عبد القادر:۔ آپ امراض چشم کے ماہر ڈاکٹر اور لیاقت میڈیکل کالج میں شعبہ امراض چشم کے سربراہ تھے۔ آپ کو 19 جون 1985ء کو حیدر آباد میں قتل کر دیا گیا۔

(2) ڈاکٹر عبد القادر:۔ آپ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے سینئر ممبر تھے اور فیصل آباد میں پریکٹس کرتے تھے۔ آپ کو 15 جون 1984ء کو فیصل آباد میں اپنے گھر میں قتل کر دیا گیا۔

(3) عبد الحکیم ابڑو:۔ آپ وارہ ضلع لاڑکانہ میں اسکول ٹیچر تھے اور چھ معصوم بچوں کے باپ اور سرپرست تھے۔ آپ کو 16 اپریل 1983ء کو رات کے وقت سوتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔

لیکن پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس قادیانی جماعت کے بہت سے افراد کے خلاف کلمہ طیبہ پڑھنے یا نماز پڑھنے کے جرم میں مقدمات قائم کر کے انہیں سزائیں دی گئیں۔

ایک وہ زمانہ تھا جب مسلمان کلمہ طیبہ کی تبلیغ اور صوم و صلوٰۃ کے قیام کے لئے دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے اور ایک دن یہ ہے کہ اگر کوئی قادیانی صدق دل سے بھی کلمہ طیبہ پڑھنا چاہے تو نہیں پڑھ سکتا۔ کیوں کہ اس کے لئے کلمہ طیبہ پڑھنے پر پابندی ہے۔ بلکہ ایسا کرنا تعزیری جرم بھی ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا کوئی بچہ سن بلوغ کو پہنچ کر قادیانی مسلک کو چھوڑنا بھی چاہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اسے قادیانی جماعت کے ساتھ منسلک رہنے پر قانوناً" مجبور کر دیا گیا ہے۔ ضیاء الحق نے اس کاروائی سے قوم کے اندر مستقل طور پر نفرت و حقارت کو فروغ دینے کے لئے اپنا فریضہ انجام دے دیا ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے ان تمام غیر شرعی، غیر انسانی حربوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ احمدیوں کو معاشی طور پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور ان کی اہلیت کی بجائے ان کے احمدی ہونے کی بنا پر ملازمتوں میں امتیاز برتا گیا۔ کلیدی عہدوں کے لئے انہیں ممنوعہ چیز قرار دے دیا گیا اور اس سے ہٹ کر بہت سے احمدیوں کو سول اور فوجی ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔

ان حالات کا شکار ہو کر جوان ہونے والی ستر کے عشرہ کی نسل پاکستان کے برہمن معاشرے میں اچھوت بن کر رہ گئی۔ ان پر تعلیمی اداروں سے لے کر گلی محلوں میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ دیہاتوں کی 75 فیصد ناخواندہ آبادی نے "ملا مافیا" کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر احمدیوں کا سماجی بائیکاٹ کر دیا ان کی مساجد کو شہید کر دیا گیا۔ شہروں میں یہ صورتحال اور بھی گھمبیر ہے۔ جہاں احمدیوں کے خلاف تنظیمیں بھرپور طریقے سے سرگرم عمل ہیں۔

ڈیمو کریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ (DCHD) کی پاکستان کی دیہی علاقوں میں انسانی حقوق کی صورتحال کی رپورٹ 1996ء میں تشویشناک نتائج سامنے آئے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق پاکستان کے دیہی علاقوں میں رہنے والی 80-70 فیصد اقلیتیں بشمول احمدیوں کو معاشرے میں اکثریتی مذہب کے مقابلے میں مساوی سماجی حقوق حاصل نہیں۔ صرف پنجاب کے 64 فیصد سے زائد اقلیتی افراد بشمول احمدیوں کے سماجی عدم رواداری کا شکار ہیں۔ جب کہ اکثریتی آبادی کے مسلمان محض نمائشی طور پر رواداری کا اظہار کرتے ہیں۔

احمدی عام زندگی میں زیادہ شدید صورتوں کا سامنا ہونے اور ریاستی سطح پر پیش آنے والی عدم

روا داری اور امتیاز کے باعث پیدا ہونے والے خونریز واقعات کے نتیجہ میں شدید نفسیاتی بیگانگی کا شکار ہیں۔ احمدی عقائد سے تعلق رکھنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں سے جسمانی، لفظی بدسلوکیوں اور ناانصافیوں کے اتنے واقعات موجود ہیں کہ اگر ان کو زیر تحریر لانے کی کوشش کی جائے تو ایک الگ دفتر درکار ہو گا۔

احمدیوں کے بچوں کو امتیاز کی بنا پر سکولوں میں داخلے سے انکار، اکثریتی فرقے کے بچوں سے کھیلنے سے جبراً" روکنا، سماجی طور پر کمتری کا احساس دلانا اس اقلیت کا ایسا المیہ ہے جو کہ ایک نسل سے دوسری نسل کو شدید صورت میں منتقل ہو رہا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ احمدیوں کو اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرنے سے سرکاری طور پر پابندی کا سامنا۔ انہیں ایک انسانی جیل میں ڈالنے کے مترادف ہے جسے دنیا کا کوئی مذہب جائز قرار نہیں دے سکتا۔

اس سے بڑھ کر "ملا مافیا" کا ایک اور حربہ جو کہ نا صرف احمدیوں کی سماجی زندگی میں بہت سے مسائل کا باعث بنا بلکہ اس سے کئی زندگیاں تباہ ہوئیں وہ خود کو احمدی ظاہر کر کے احمدیوں سے سماجی تعلقات استوار کر کے ان کی بچیوں سے شادی کے بعد انہیں زبردستی احمدی عقائد سے منحرف ہونے کے لئے آمادہ کرنا تھا اور اس کوشش کی ناکامی کی صورت میں بہت سی احمدی بچیاں طلاق حاصل کر کے پاکستان کی مردانہ سوسائٹی کے رحم و کرم پر ہیں۔

ضیاء الحق کے دور میں جاری ہونے والا یہ ظلم کا باب آج بھی کھلا ہوا ہے اور آج بھی پاکستان کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو "ملا مافیا" کی جانب سے احمدیوں کے سر تھوپ دیا جاتا ہے اور اس برہمن سماج میں جوان ہونے والی نسل ایک ڈیپریشن اور نفسیاتی مریض نسل کے سوا کچھ نہیں۔ احمدی نوجوانوں کو اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کے لئے اپنی زندگیوں کے چراغ گل کرنے پڑتے ہیں۔

ضمیمہ

ختم نبوت پر قومی اسمبلی کا متفقہ فیصلہ

(اسلام آباد- 7 ستمبر 1974ء)

ان صفحات میں خصوصی کمیٹی کی قرارداد کا متن، آئین میں ترمیم کا بل، اور وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر کا متن دیا جارہا ہے جو انہوں نے 7 ستمبر 1974ء کو اس وقت کی، جب کہ پارلیمنٹ نے ختم نبوت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے قانون پاس کیا۔

قرارداد

قومی اسمبلی کے کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی متفقہ طور پر طے کرتی ہے کہ حسب ذیل سفارشات قومی اسمبلی کو غور اور منظوری کے لئے بھیجی جائیں۔

کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی اپنی رہنما کمیٹی اور ذیلی کمیٹی کی طرف سے اس کے سامنے پیش یا قومی اسمبلی کی طرف سے اس کو بھیجی گئی۔ قراردادوں پر غور کرنے اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے اور گواہوں بشمول سربراہان انجمن احمدیہ، ربوہ اور انجمن احمدیہ اشاعت اسلام، لاہور کی شہادتوں اور جرح پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور پر قومی اسمبلی کو حسب ذیل سفارشات پیش کرتی ہے۔

(الف) کہ پاکستان کے آئین میں حسب ذیل ترمیم کی جائے:۔

(اول) دفعہ 106(3) میں قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) کا ذکر کیا جائے۔

(دوم) دفعہ 260 میں ایک نئی شق کے ذریعے غیر مسلم کی تعریف درج کی جائے۔

مذکورہ بالا سفارشات کے نفاذ کے لئے خصوصی کمیٹی کی طرف سے متفقہ طور پر منظور شدہ مسودہ قانون منسلک ہے۔

(ب) کہ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 الف میں حسب ذیل تشریح درج کی جائے۔

تشریح:- کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ 260 کی شق (3) کی تصریحات کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے خاتم النبین ہونے کے تصور کے خلاف عقیدہ رکھے یا عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہذا کے تحت مستوجب سزا ہو گا۔

(ج) کہ متعلقہ قوانین مثلاً قومی رجسٹریشن ایکٹ، 1973ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد، 1974ء میں منتخبہ قانونی اور ضابطہ کی ترمیمات کی جائیں۔

(د) کہ پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، کے جان و مال، آزادی، عزت اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا۔

(قومی اسمبلی میں پیش کئے جانے کے لئے)

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مزید ترمیم کرنے کے لئے

ایک بل

ہرگاہ یہ قرین مصلحت ہے کہ بعد ازیں درج اغراض کے لئے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم کی جائے۔

لہٰذا بذریعہ ہذا حسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے۔

1- مختصر عنوان اور آغاز نفاذ

(1) یہ ایکٹ آئین (ترمیم دوم) ایکٹ 1974ء کہلائے گا۔ (2) یہ فی الفور نافذ العمل ہو گا۔

2- آئین کی دفعہ 106 میں ترمیم

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں، جسے بعد ازیں آئین کہا جائے گا، دفعہ 106 کی شق (3)

میں لفظ فرقوں کے بعد الفاظ اور قوسین "اور قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) درج کئے جائیں گے۔"

3- آئین کی دفعہ 260 میں ترمیم

آئین کی دفعہ 260 میں شق (2) کے بعد حسب ذیل نئی شق درج کی جائے گی، یعنی:۔

"(3) جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم، جو آخری نبی ہیں، کے خاتم النبین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے بعد کسی بھی مفہوم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے، وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لئے مسلمان نہیں ہے۔

بیان اغراض ووجود

جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارش کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے، اس بل کا مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر وہ شخص جو محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے خاتم النبین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے، اسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ

وزیر انچارج

وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر

جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم پاکستان کی اس تقریر کا متن، جو انہوں نے قومی اسمبلی میں 7 ستمبر 1974ء کو کی تھی:

جناب اسپیکر!

میں جب یہ کہتا ہوں کہ یہ فیصلہ پورے ایوان کا فیصلہ ہے تو اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں کوئی سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لئے اس بات پر زور دے رہا ہوں۔ ہم نے اس مسئلے پر ایوان کے ممبروں سے تفصیلی طور پر تبادلہ خیال کیا ہے' جن میں تمام پارٹیوں کے اور ہر طبقہ خیال کے نمائندے موجود تھے۔ آج کے روز جو فیصلہ ہوا ہے یہ ایک قومی فیصلہ ہے' یہ پاکستان کے عوام کا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ پاکستان کے مسلمانوں کے ارادے' خواہشات' اور ان کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ فقط حکومت ہی اس فیصلے کی تحسین کی مستحق قرار پائے۔ اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایک فرد اس فیصلے کی تعریف و تحسین کا حقدار بنے۔ میرا کہنا یہ ہے یہ مشکل فیصلہ' بلکہ میری ناچیز رائے میں کئی پہلوؤں سے بہت مشکل فیصلہ' جمہوری اداروں اور جمہوری حکومت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ ایک پرانا مسئلہ ہے۔ نوے سال پرانا مسئلہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ اس سے ہمارے معاشرے میں تلخیاں اور تفرقے پیدا ہوئے' لیکن آج کے دن تک اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جا سکا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ ماضی میں بھی پیدا ہوا تھا' ایک بار نہیں' بلکہ کئی بار' ہمیں بتایا گیا کہ ماضی میں اس مسئلے پر جس طرح قابو پایا گیا تھا' اسی طرح اب کی بار بھی ویسے ہی اقدامات سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس سے پہلے کیا کچھ کیا گیا' لیکن مجھے معلوم ہے کہ 1953ء میں کیا کیا تھا۔ 1953ء میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے وحشیانہ طور پر طاقت کا استعمال کیا گیا تھا' جو اس مسئلے کے حل کے لئے نہیں' بلکہ اس مسئلے کو دبا دینے کے لئے تھا۔ کسی مسئلے کو دبا دینے سے اس کا حل نہیں نکلتا۔ اگر کچھ صاحبان عقل و فہم حکومت کو یہ مشورہ دیتے کہ عوام پر تشدد کر کے اس مسئلے کو حل کیا جائے۔ اور عوام کے جذبات اور ان کی خواہشات کو کچل دیا جائے' تو شاید اس صورت میں ایک عارضی حل نکل آتا' لیکن یہ مسئلے کا صحیح اور درست حل نہ ہوتا۔ مسئلہ دب تو جاتا' اور پس منظر میں چلا جاتا' لیکن یہ مسئلہ ختم نہ ہوتا۔

ہماری موجودہ مساعی کا مقصد یہ رہا ہے کہ اس مسئلے کا مستقل حل تلاش کیا جائے اور میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہم نے صحیح اور درست حل تلاش کرنے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ

درست ہے کہ لوگوں کے جذبات مشتعل ہوئے' غیر معمولی احساسات ابھرے۔ قانون اور امن کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ جائیداد اور جانوں کا اتلاف ہوا۔ پریشانی کے لمحات بھی آئے۔ تمام قوم گذشتہ تین ماہ سے تشویش کے عالم میں رہی اور اس پر کشمکش اور بیم و رجا کے عالم میں رہی۔ طرح طرح کی افواہیں کثرت سے پھیلائی گئیں' اور تقریریں کی گئیں۔ مسجدوں اور گلیوں میں بھی تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں یہاں اور اس وقت یہ دہرانا نہیں چاہتا کہ 22 اور 29 مئی کو کیا ہوا تھا۔ میں موجودہ مسئلے کی وجوہات کے بارے میں بھی کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ یہ مسئلہ کس طرح رونما ہوا' اور کس طرح اس نے جنگل کی آگ کی طرح تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میرے لئے اس وقت یہ مناسب نہیں کہ میں موجودہ معاملات کی تہہ تک جاؤں' لیکن میں اجازت چاہتا ہوں کہ اس معزز ایوان کی توجہ اس تقریر کی طرف دلاؤں جو میں نے قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے 13 جون کو کی تھی۔

اس تقریر میں' میں نے پاکستان کے عوام سے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یہ مسئلہ بنیادی اور اصولی طور پر مذہبی مسئلہ ہے۔ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے۔ پاکستان مسلمانوں کے لئے وجود میں آیا تھا۔ اگر کوئی ایسا فیصلہ کر لیا جاتا' جسے اس ملک کے مسلمانوں کی اکثریت' اسلام کی تعلیمات اور اعتقادات کے خلاف سمجھتی تو اس سے پاکستان کی علت نمائی اور اس کے تصور کو بھی ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا۔ چونکہ یہ مسئلہ خالص مذہبی مسئلہ تھا۔ اس لئے میری حکومت کے لئے یا ایک فرد کی حیثیت میں میرے لئے مناسب نہ تھا کہ اس پر تیرہ جون کو کوئی فیصلہ دیا جاتا۔

لاہور میں مجھے کئی ایک ایسے لوگ ملے جو اس مسئلے کے باعث مشتعل تھے۔ وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ آپ آج ہی' ابھی ابھی اور یہیں وہ اعلان کیوں نہیں کر دیتے جو کہ پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت چاہتی ہے۔ ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ یہ اعلان کر دیں تو اس سے آپ کی حکومت کو بڑی داد و تحسین ملے گی اور آپ کو ایک فرد کے طور پر نہایت شاندار شہرت اور ناموری حاصل ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے عوام کی خواہشات کو پورا کرنے کا یہ موقع گنوا دیا تو آپ اپنی زندگی کے سنہری موقعے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ میں نے اپنے ان احباب سے کہا کہ یہ ایک انتہائی پیچیدہ اور بسیط مسئلہ ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو نوے سال سے پریشان کر رکھا ہے اور پاکستان بننے کے ساتھ ہی یہ پاکستان کے مسلمانوں کے لئے بھی پریشانی کا باعث بنا ہے۔ میرے لئے یہ مناسب نہ

تھا کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا' اور کوئی فیصلہ کر دیتا۔ میں نے ان اصحاب سے کہا کہ ہم نے پاکستان میں جمہوریت کو بحال اور قائم کیا ہے۔ پاکستان کی ایک قومی اسمبلی موجود ہے جو ملکی مسائل پر بحث کرنے کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ میری ناچیز رائے میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے قومی اسمبلی ہی مناسب جگہ ہے۔ اور اکثریتی پارٹی کے رہنما ہونے کی حیثیت میں میں قومی اسمبلی کے ممبروں پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالوں گا۔ میں اس مسئلے کے حل کو قومی اسمبلی کے ممبروں کے ضمیر پر چھوڑتا ہوں' اور ان میں میری پارٹی کے ممبر بھی شامل ہیں۔ پاکستان پیپلزپارٹی کے ممبر میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ جہاں میں نے کئی ایک مواقع پر انہیں بلا کر اپنی پارٹی کے موقف سے آگاہ کیا' وہاں اس مسئلے پر میں نے اپنی پارٹی کے ایک ممبر پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ سوائے ایک موقع کے جب کہ اس مسئلے پر کھلی بحث ہوئی تھی۔

جناب اسپیکر! میں آپ کو یہ بتانا نامناسب نہیں سمجھتا کہ اس مسئلے کے باعث اکثر پریشان رہا اور راتوں کو مجھے نیند نہیں آئی۔ اس مسئلے پر جو فیصلہ ہوا ہے' میں اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے اس فیصلے کے سیاسی اور معاشی ردعمل اور اس کی پیچیدگیوں کا علم ہے' جس کا اثر مملکت کے تحفظ پر ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے' لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ پاکستان وہ ملک ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کی اس خواہش پر وجود میں آیا کہ وہ اپنے لئے ایک علیحدہ مملکت چاہتے تھے۔ اس ملک کے باشندوں کی اکثریت کا مذہب اسلام ہے۔ میں اس فیصلے کو جمہوری طریقے سے نافذ کرنے میں اپنے کسی بھی اصول کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ پاکستان پیپلزپارٹی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ اسلام کی خدمت ہماری پارٹی کے لئے اولین اہمیت رکھتی ہے۔ ہمارا دوسرا اصول یہ ہے کہ جمہوریت ہماری پالیسی ہے۔ چنانچہ ہمارے لئے فقط یہی درست راستہ تھا کہ ہم اس مسئلے کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں پیش کرتے۔ اس کے ساتھ ہی میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم اپنی پارٹی کے اس اصول کی بھی پوری طرح سے پابندی کریں گے کہ پاکستان کی معیشت کی بنیاد سوشلزم پر ہو۔ ہم سوشلسٹ اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ جو کیا گیا ہے' اس فیصلے میں ہم نے اپنے کسی بھی اصول سے انحراف نہیں کیا۔ ہم اپنی پارٹی کے تین اصولوں پر مکمل طور سے پابند رہے ہیں۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ اسلام کے بنیادی اور اعلیٰ ترین اصول' سماجی انصاف کے خلاف نہیں۔ اور سوشلزم

کے ذریعے معاشی استحصال کو ختم کرنے کے بھی خلاف نہیں ہیں۔

یہ فیصلہ مذہبی بھی ہے اور غیر مذہبی بھی۔ مذہبی اس لحاظ سے کہ یہ فیصلہ ان مسلمانوں کو متاثر کرتا ہے جو پاکستان میں اکثریت میں ہیں اور غیر مذہبی اس لحاظ سے کہ ہم دور جدید میں رہتے بستے ہیں۔ ہمارا آئین کسی مذہب و ملت کے خلاف نہیں بلکہ ہم نے پاکستان کے تمام شہریوں کو یکساں حقوق دیئے ہیں۔ ہر پاکستان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ فخر و اعتماد سے بغیر کسی خوف کے اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کر سکے۔ پاکستان کے آئین میں پاکستانی شہریوں کو اس امر کی ضمانت دی گئی ہے۔ میری حکومت کے لئے اب یہ بات بہت اہم ہو گئی ہے کہ وہ پاکستان کے تمام شہریوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ یہ نہایت ضروری ہے اور میں اس بات میں کوئی ابہام کی گنجائش نہیں رکھنا چاہتا۔ پاکستان کے شہریوں کے حقوق کی حفاظت ہمارا اخلاق' مقدس اسلامی فرض ہے۔ جناب اسپیکر! میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں اور اس ایوان کے باہر کے ہر شخص کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ فرض پوری طرح اور مکمل طور پر ادا کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں کسی شخص کے ذہن میں شبہ نہیں رہنا چاہیے۔ ہم کسی قسم کی غارتگری اور تہذیب سوزی یا کسی پاکستانی طبقے یا شہری کی توہین اور بے عزتی برداشت نہیں کریں گے۔

جناب اسپیکر! گذشتہ تین مہینوں کے دوران اور اس بڑے بحران کے عرصے میں کچھ گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ کئی لوگوں کو جیل میں بھیجا گیا اور چند اور اقدامات کئے گئے۔ یہ بھی ہمارا فرض تھا۔ ہم اس ملک پر بد نظمی کا اور نراجی عناصر کا غلبہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جو ہمارے فرائض تھے' ان کے تحت ہمیں یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ لیکن میں اس موقعے پر جب کہ تمام ایوان نے متفقہ طور سے ایک اہم فیصلہ کر لیا ہے' آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ہر معاملے پر فوری اور جلد از جلد غور کریں گے' اور جب کہ اس مسئلے کا باب بند ہو چکا ہے' ہمارے لئے یہ ممکن ہو گا کہ ان سے نرمی کا برتاؤ کریں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مناسب وقت کے اندر اندر کچھ ایسے افراد سے نرمی برتی جائے گی اور انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ جنھوں نے اس عرصے میں اشتعال انگیزی سے کام لیا یا کوئی اور مسئلہ پیدا کیا۔

جناب اسپیکر! جیسا کہ میں نے کہا ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ ہم نے اس مسئلے کا باب بند کر دیا ہے۔ یہ میری کامیابی نہیں' یہ حکومت کی بھی کامیابی نہیں' یہ کامیابی پاکستان کے عوام کی کامیابی

ہے۔ جس میں ہم بھی شریک ہیں۔ میں سارے ایوان کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں' مجھے احساس ہے کہ یہ فیصلہ متفقہ طور پر نہ کیا جا سکتا۔ اگر تمام ایوان کی جانب سے اور اس میں تمام پارٹیوں کی جانب سے تعاون اور مفاہمت کا جذبہ نہ ہوتا۔ آئین ہمارے ملک کا بنیادی قانون ہے۔ اس آئین کے بنانے میں ستائیس برس صرف ہوئے اور وہ وقت پاکستان کی تاریخ میں تاریخی اور یادگار وقت تھا جب اس آئین کو تمام پارٹیوں نے قبول کیا اور پاکستان کی قومی اسمبلی نے اسے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ اسی جذبے کے تحت' ہم نے یہ مشکل فیصلہ بھی کر لیا ہے۔

جناب اسپیکر! کیا معلوم کہ مستقبل میں ہمیں زیادہ مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑے' لیکن میری ناچیز رائے میں جب سے پاکستان وجود میں آیا' یہ مسئلہ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ تھا۔ کل کو اس سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل مسائل ہمارے سامنے آ سکتے ہیں۔ جن کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ماضی کو دیکھتے ہوئے اس مسئلے کے تاریخی پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرتے ہوئے۔ پھر کہوں گا کہ یہ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ تھا گھر گھر میں اس کا اثر تھا' ہر دیہات میں اس کا اثر تھا' اور ہر فرد پر اس کا اثر تھا۔ یہ مسئلہ سنگین سے سنگین تر ہوتا چلا گیا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک خوفناک شکل اختیار کر گیا ہمیں اس مسئلے کو حل کرنا ہی تھا' ہمیں تلخ حقائق کا سامنا کرنا ہی تھا۔ ہم اس مسئلے کو ہائی کورٹ یا اسلامی نظریاتی کونسل کے سپرد کر سکتے تھے یا اسے اسلامی سیکرٹریٹ کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ حکومت اور حتیٰ کہ افراد بھی مسائل کو ٹالنا جانتے ہیں اور انہیں جوں کا توں رکھ سکتے ہیں اور حاضرہ صورت حال سے نبٹنے کے لئے معمولی اقدامات کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے اس مسئلے کو اس انداز سے نبٹانے کی کوشش نہیں کی۔ ہم اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے حل کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ اس جذبے کے تحت قومی اسمبلی ایک کمیٹی کی صورت میں خفیہ اجلاس کرتی رہی۔ خفیہ اجلاس کرنے کے لئے قومی اسمبلی کے پاس کئی ایک وجوہات تھیں۔ اگر قومی اسمبلی خفیہ اجلاس نہ کرتی' تو جناب! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام سچی باتیں اور حقائق ہمارے سامنے آ سکتے؟ اور لوگ اس طرح آزادی اور بغیر کسی جھجک کے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے؟ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ یہاں اخبارات کے نمائندے بیٹھے ہوئے ہیں' اور لوگوں تک ان کی باتیں پہنچ رہی ہیں۔ اور ان کی تقاریر اور بیانات کو اخبارات کے ذریعے شائع کر کے ان کا ریکارڈ رکھا جا رہا ہے تو اسمبلی کے ممبر اس اعتماد

اور کھلے دل سے اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکتے' جیسا کہ انہوں نے خفیہ اجلاسوں میں کیا ہمیں ان اجلاسوں کی کارروائی کا کافی عرصہ تک احترام کرنا چاہیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ کوئی بات بھی خفیہ نہیں رہتی۔ لیکن ان باتوں کے اظہار کا ایک موزوں وقت ہے چونکہ اسمبلی کی کارروائی خفیہ رہی ہے' اور ہم نے اسمبلی کے ہر ممبر کو' ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی جو ہمارے سامنے پیش ہوئے یہ یقین دلایا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کو سیاسی' یا کسی اور مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کے بیانات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے گا۔ میرے خیال میں یہ ایوان کے لئے ضروری اور مناسب ہے کہ وہ ان خفیہ اجلاسوں کی کارروائی کو ایک خاص وقت تک ظاہر نہ کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے لئے ممکن ہو گا کہ ہم ان خفیہ اجلاسوں کی کارروائی کو آشکار کر دیں' کیوں کہ اس کے ریکارڈ کو دفن ہی کر دیا جائے' ہرگز نہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ بات ہو گی۔ میں فقط یہ کہتا ہوں کہ اگر اس مسئلے کے باب کو ختم کرنے کے لئے اور ایک نیا باب کھولنے کے لئے نئی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے' آگے بڑھنے کے لئے اور قومی مفاد کو محفوظ رکھنے کے لئے اور پاکستان کے حالات کو معمول پر رکھنے کے لئے اس مسئلے کی بابت ہی نہیں بلکہ دوسرے مسائل کی بابت بھی' ہمیں ان امور کو رکھنا ہو گا۔ میں ایوان پر یہ بات عیاں کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کے حل کو' دوسرے کئی مسائل پر تبادلہ خیال اور بات چیت اور مفاہمت کے لئے نیک شگون سمجھنا چاہیے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ یہ حل ہمارے لئے خوشی کا باعث ہے' اور اب ہم آگے بڑھیں گے اور تمام نئے قومی مسائل کو مفاہمت اور سمجھوتے کے جذبے کے تحت طے کریں گے۔

جناب اسپیکر! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس معاملے کے بارے میں مجھے جو احساسات تھے میں انہیں بیان کر چکا ہوں۔ میں ایک بار پھر دہراتا ہوں کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے' یہ ایک فیصلہ ہے جو ہمارے عقائد سے متعلق ہے اور یہ فیصلہ پورے ایوان کا فیصلہ ہے اور پوری قوم کا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ عوامی خواہشات کے مطابق ہے۔ میرے خیال میں یہ انسانی طاقت سے باہر تھا کہ یہ ایوان اس سے بہتر کچھ فیصلہ کر سکتا۔ اور میرے خیال میں یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس مسئلے کو دوامی طور پر حل کرنے کے لئے موجودہ فیصلے سے کم کوئی اور فیصلہ ہو سکتا تھا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جو اس فیصلے سے خوش نہ ہوں۔ ہم یہ توقع بھی نہیں کر سکتے کہ اس مسئلے کے فیصلے سے تمام لوگ خوش ہو سکیں گے جو گذشتہ نوے سال سے حل نہیں ہو سکا۔ اگر یہ مسئلہ آسان ہوتا اور ہر ایک کو خوش رکھنا ممکن ہوتا، تو یہ مسئلہ بہت پہلے حل ہو گیا ہوتا، لیکن یہ نہیں ہو سکا۔ 1953ء میں بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ 1953ء میں حل ہو چکا تھا، وہ لوگ اصل صورت حال کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس فیصلے پر نہایت ناخوش ہوں گے۔ اب میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں ان لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کروں۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ ان لوگوں کے طویل المیعاد مفاد کے حق میں ہے کہ یہ مسئلہ حل کر لیا گیا ہے۔ آج یہ لوگ ناخوش ہوں گے، ان کو یہ فیصلہ پسند نہ ہو گا، ان کو یہ فیصلہ ناگوار ہو گا، لیکن حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اور مفروضے کے طور پر اپنے آپ کو ان لوگوں میں سے شمار کرتے ہوئے۔ میں یہ کہوں گا کہ ان کو بھی اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ اس فیصلے سے یہ مسئلہ حل ہوا اور ان کو آئینی حقوق کی ضمانت حاصل ہو گئی۔ مجھے یاد ہے جب کہ حزب مخالف سے مولانا شاہ احمد نورانی نے یہ تحریک پیش کی تو انہوں نے ان لوگوں کو مکمل تحفظ دینے کا ذکر کیا تھا جو اس فیصلے سے متاثر ہوں گے۔ ایوان اس یقین دہانی پر قائم ہے۔ یہ ہر پارٹی کا فرض ہے۔ یہ حکومت کا فرض ہے۔ حزب مخالف کا فرض ہے اور ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کے تمام شہریوں کی یکساں طور پر حفاظت کریں۔ اسلام کی تعلیم رواداری ہے۔ مسلمان رواداری پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اسلام نے فقط رواداری کی تبلیغ ہی نہیں کی بلکہ تمام تاریخ میں اسلامی معاشرے نے رواداری سے کام لیا ہے۔ اسلامی معاشرے نے اس تیرہ و تاریک زمانے میں یہودیوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا، جب کہ عیسائیت ان پر یورپ میں ظلم کر رہی تھی اور یہودیوں نے سلطنت عثمانیہ میں آ کر پناہ لی تھی۔ اگر یہودی دوسرے حکمران معاشرے سے بچ کر عربوں اور ترکوں کے اسلامی معاشرے میں پناہ لے سکتے تھے، تو پھر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری مملکت اسلامی مملکت ہے۔ ہم مسلمان ہیں، ہم پاکستانی ہیں، اور یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ ہم تمام فرقوں، تمام لوگوں، اور پاکستان کے تمام شہریوں کو یکساں طور پر تحفظ دیں۔

جناب سپیکر! ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ آپ کا شکریہ!

باب 5

پاکستانی قوانین اور عدم رواداری

اقوام متحدہ کمیشن برائے انسانی حقوق کی ایک قرار داد کی روشنی میں مذہبی "رواداری" سے متعلق تنظیم کے خصوصی جائزہ کار مسٹر عبدالفتح امر نے جون 1995ء میں پاکستان کا دورہ کیا' اس دورہ سے متعلق انہوں نے 1996ء کے اوائل میں اپنی رپورٹ اقوام متحدہ کے کمیشنِ برائے انسانی حقوق کو پیش کی۔ پاکستان کے تعصب پسند مذہبی معاشرے کے مشاہدات کی روشنی میں جائزہ کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ موجودہ پاکستانی ریاستی قوانین جن کا تعلق مذہبی اقلیتوں اور مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر رواداری اور غیر امتیازی سلوک سے ہے وہ معاشرے میں عدم رواداری کی حمایت یا اس کی حوصلہ افزائی کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔

"قانون جو خاص طور پر احمدیوں کے لئے تشکیل دیا گیا ہے قابل اعتراض اور بعض لحاظ سے بلاجواز ہے کسی بھی عقیدے کے خلاف Blasphemy بطور ایک جرم' خصوصی قانون سازی کا تقاضہ کرتی ہے۔ تاہم یہ قانون سازی امتیازی سلوک کے مترادف نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی یہ اتنا مبہم ہو کہ انسانی حقوق خطرے میں پڑ جائیں۔ خاص طور پر اقلیتوں کے عقیدے کے خلاف جرائم کو اگر عام قانون کے تحت قابل سزا قرار دیا جاتا ہے تو قانونی ضمن کے تحت ضمانتیں بھی فراہم کی جانی چاہئیں جو کہ آج تک حاصل نہیں۔ ضمیر کی آزادی اور عبادت کی آزادی کو تحفظ دینا واضح طور پر ایک ضرورت ہے۔ Blasphemy کے لئے موت کی سزا دینا غیر مناسب' انسانیت سوز اور انتہائی قابل مذمت عمل ہے۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ جب یہ بسا اوقات تعلیم اور ثقافت کے بہت ہی کم تر معیار کی عکاسی کرتے ہوں۔

1969ء سے 1973ء تک پاکستان دستور سازی کی مشق کرنے والوں نے انسانی حقوق کے عالمی منشور کو نظرانداز تو نہیں کیا مگر اسے مکمل طور پر بنیادی حقوق کے باب میں شامل بھی نہیں کیا۔ بلکہ عوامی سطح پر اقلیتوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لئے ان انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو مذہبی اور سرکاری سطح کی حمایت اور آشیرباد شامل رہی۔

ریاست کا نام' صدر کے عہدے کے لئے غیر مسلموں کا نااہل قرار دیئے جانا اور قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے نعرے' پاکستان کے انتہاپسند ملاؤں کو ظلم و بربریت کے باب رقم کرنے کے لئے سرکاری رعایتیں دیتے آرہے تھے۔ جن کا فائدہ اٹھا کر وہ 1949ء سے 1953ء تک احمدیوں کے خلاف بدترین جرائم کے مرتکب ہوتے رہے۔

1973ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے جو اسلامی سوشلزم کا نعرہ لے کر میدان سیاست کے فاتح قرار پائے اپنے تشکیل کردہ نئے آئین 1973ء میں انہوں نے "ملا" کو مزید رعایتیں دے کر ان کے ہاتھ میں عملاً" سرکاری ہتھیار دے دیئے۔ آرٹیکل نمبر2 میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا۔ جبکہ آرٹیکل 91 کی عبارت کو اس طرح مرتب کیا گیا کہ غیر مسلموں کے لئے وزیراعظم کا عہدہ حاصل کرنا ممکن ہی نہ رہا اور یوں سیاسی طور پر ان کے حقوق کو صلب کر دیا گیا۔ جبکہ اسی آئین میں دوسری ترمیم کے ذریعے احمدیوں کو اقلیت قرار دے کر مذہبی مخالف سیاسی اتحاد کو راضی کر کے اپنی حکومت بچانے کی ناکام کوشش کی۔ احمدیوں کو دائرہ اسلام سے ہی خارج کر دیا گیا۔ جبکہ قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں کئی عدالتیں احمدیوں کو اصلاح پذیر مسلمانوں کا فرقہ قرار دے چکی تھیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کا بعد میں فوجی قیادت نے تختہ الٹ دیا۔ مگر اس اقتدار کی تبدیلی سے پاکستان کے اقلیتی عوام اور بالخصوص احمدیوں کے لئے تاریخ کے اس سیاہ ترین دور کا آغاز ہوا جو آج تک جاری ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں اقلیتی عوام کے حقوق کو بری طرح پامال کیا گیا اور خاص طور پر احمدیوں کو سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر حکومتی حمایت سے بدترین تشدد اور جبر کا نشانہ بنایا گیا۔ ضیاء الحق کے دور میں دستور کے آرٹیکل 91 کو منسوخ کر کے وزیراعظم کے لئے قومی اسمبلی کا مسلمان رکن ہونا لازمی قرار دے دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کی مسلط کردہ آئینی ترامیم نے پاکستانی معاشرت میں

بنیادی حقوق کے تصورات اور انسانی حقوق کے عالمی منشور کی روح کو کچل کر رکھ دیا۔

ضیا مارشل لاء کے ابتداء میں ہی وفاقی شرعی عدالت کا ادارہ قائم کیا گیا جس کو اختیار حاصل تھا کہ جس قانون کو اسلامی قوانین کے منافی خیال کرے، منسوخ کر دے اب اسے آئین کے ایسے حصوں کی تنسیخ کا اختیار بھی سونپ دیا گیا جو عدالت کی صوابدید میں اسلام کے منافی ہیں۔

جبکہ وفاقی شرعی عدالت کو ملنے والے یہ اختیارات قرارداد مقاصد کے اصولوں کے منافی ہیں جس کی رو سے صرف عوام ہی قانون سازی کا حق رکھتے ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی منشور کی شق نمبر 21 کے مطابق بھی ریاست کے اختیارات کا ماخذ عوام کی رائے ہے۔ آئین کے آرٹیکل 51 میں ترمیم کے ذریعے ملک میں از سر نو جداگانہ انتخابات کا طریقہ متعارف کرایا گیا۔ جو کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور کی شق نمبر 21 سے متصادم ہے۔ جبکہ اس ترمیم سے قبل اقلیتوں کی مخصوص نشستیں ان کو امتیاز کا نشانہ بنانے کی بجائے سہولت بہم پہنچاتا تھا۔ ان سب ترامیم پر مستزاد یہ کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا قابل نفاذ حصہ بنا دیا گیا۔ جس سے عدلیہ کو بھی کئی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جنرل ضیاء الحق نے اس قرارداد مقاصد کے متن میں بھی ایک من مانی ترمیم کر ڈالی۔ اصل قرارداد میں اقلیتوں کو آزادانہ طور پر اپنے عقائد کے اظہار اور ان پر عمل کا حق دیا گیا تھا۔ جبکہ ضیاء الحق نے ایک ترمیم کے ذریعے قرار داد سے (آزادانہ طور پر) کے الفاظ حذف کرا دیئے۔ ویسے بھی جنرل ضیاء مذہبی اقلیتوں کے بنیادی حقوق کے قائل نہیں تھے اور خصوصاً احمدیوں کے حوالے سے ان کا رویہ اپنے پورے دور میں جابر حکمران کا سا رہا اور احمدیوں سے مفتوح قوم کا سا سلوک روا رکھا۔

اس دور میں متعدد ایسی آئینی ترامیم لائی گئیں جن میں عقیدے اور جنس کی بنیاد پر شہریوں سے امتیاز روا رکھا گیا تھا۔

تعزیرات پاکستان میں مذہب کے خلاف جرائم کے حوالے سے انتہائی متنازع ترامیم کی گئیں۔ دفعہ 295-C میں توہین رسالت پر موت یا عمر قید کی سزا رکھی گئی تھی بعد ازاں وفاقی شرعت عدالت کے حکم پر اس جرم کی واحد سزا موت قرار دی گئی۔ دفعہ 298 بی اور 298 سی میں احمدیوں کو اسلامی شعار، نامِ اور رسوم پر عملدرآمد سے روک دیا گیا نیز ان کے لئے اپنے عقائد کی ترویج و اشاعت پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ احمدیوں کی عبادت گاہوں کو مساجد کہنے، ان پر کلمہ لکھنے پر ہزاروں

مقدمات بنے۔ حکومت کی اس رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے "ملا مافیا" جو کہ ہمیشہ سے اس موقعہ کی تاک میں تھا' منظر عام پر آیا اور احمدی اب اس ملک میں' جس کے قیام سے لے کر تعمیر و ترقی تک میں انہوں نے اپنا خون پسینہ بہایا تھا' چوتھے درجے سے بھی کم حیثیت میں زندگیاں گذارنے پر مجبور ہیں۔ پاکستانی برہمن معاشرہ میں ان کی حیثیت کسی طور پر بھی "اچھوت" سے کم نہیں۔

اقوام متحدہ سے منسلک تنظیم "ہیومن رائٹس ایڈوو کیٹس" نے 1987ء میں پاکستانی ریاست اور انتہاپسند مذہبی عناصر کی قادیانی عوام کے خلاف ظلم و بربریت کی جو رپورٹ اقوام متحدہ میں پیش کی اس کا احوال درج ذیل ہے۔ یاد رہے کہ یہ رپورٹ کیرن پارکر نے پیش کی تھی جو اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ رپورٹ کے مطابق......

آرڈیننس XX کے نفاذ کے بعد' احمدی ہر کہیں ریاست کی طرف سے زیادتی' امتیازی برتاؤ' محرومیوں' گرفتاریوں اور تشدد کا شکار ہونے شروع ہو گئے۔ کلمہ پڑھنا یا لکھنا' اور کسی بھی قسم کی مذہبی سرگرمی ادا کرنا احمدیوں پر "حرام" قرار دیا گیا۔ ریاست کی طرف سے نفاذ کئے گئے ان غیر انسانی قوانین نے درحقیقت ریاستی عوام کو یہ "لائسنس" دے دیا کہ وہ احمدیوں کو قتل کرنے' تشدد کرنے اور ہر قسم کے اقدام کے لئے آزاد ہیں۔ درج ذیل رپورٹ ان گرفتاریوں پر ایک نگاہ ڈالتی ہے جو احمدی مسلمانوں کے خلاف روا رکھی گئیں۔

سکھر کیس

23 مئی 1985ء کو ستائیس احمدی مسلمانوں کو سکھر اور اس کے گرد و نواح سے مسجد پر بم سے حملہ کرنے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا۔ ان گرفتار شدگان میں سے سات کو خصوصی ملٹری کورٹ میں لے جایا گیا جبکہ باقی کو جون کے پہلے ہفتے میں رہا کر دیا گیا۔

کنری ڈسٹرکٹ (سندھ) کلمہ کیس

اپریل اور مئی 1985ء میں 101 احمدیوں کو کلمہ لکھنے اور اسلام پر اپنا عقیدہ ظاہر کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ گرفتار کروانے والوں کا تعلق ایک مذہبی فرقے سے تھا جو پولیس کو اکسانے میں کامیاب رہے۔

13 احمدیوں کی گرفتاری کا مشہور کیس

اپریل 26 اور یکم مئی 1985ء کے درمیان 13 احمدی لیڈروں کو تھرپارکر سے "West Pakistan Maintenance of Public Order Ordinance of 1960" کے تحت گرفتار کیا گیا اور تیس دنوں تک حراست میں رکھا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رسول بخش بلوچ نے گرفتاری کی وجہ احمدیوں کی کلمہ طیبہ کا "Badge" لگانا بتائی جو کہ ان کی زبان میں "مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا ہے" گرفتار ہونے والے ان لوگوں کے نام یہ ہیں' محمد سلیم' منور احمد بھٹی' مرزا محمد رفیع' ڈاکٹر نثار احمد مورانی' عبدالکریم' نصیر احمد زاہد' سید سعید احمد زاہد' ملک نذیر احمد زاہد' مبشر احمد' عبدالشرور مبشر' ملک غلام احمد' ناصر احمد' احسان اللہ' بعد میں یہ لوگ رہا کر دیئے گئے۔

پہلا ماڈل کالونی کیس (کراچی)

20 مئی 1984ء کو ندیم احمد (عمر سترہ سال) ولد محمد اقبال منہاس' وسیم احمد (عمر 20 سال) ولد ناصر احمد اور خالد محمد (عمر سترہ سال) ولد سیر محمود کلمہ اپنی چھاتیوں پر لگانے کے "جرم" میں گرفتار کئے گئے۔ ان کیسوں کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔

ڈرگ روڈ (کراچی) کے مقدمے

ان کیسوں میں پانچ مختلف مقدمے درج کئے گئے۔ کلمہ لکھنے اور "Display" کرنے پر احمدیوں کی اس مسجد میں جو ڈرگ روڈ پر واقع ہے۔ راجہ ناصر کو 22 فروری 1985ء کو مسلمانوں کے "جذبات" مجروح کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ اسی دن رات تین بجے سب۔ڈویژن مجسٹریٹ کی قیادت میں پولیس کی بھاری نفری مقامی احمدی مسجد میں داخل ہوئی اور نقص امن کے الزام میں 41 افراد کو گرفتار کیا جو اگلے دن جمعہ کے اجتماع کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اسی طرح راجہ ناصر احمد کو مسجد کی پچھلی طرف کلمہ آویزاں کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ سیشن جج نے بعد میں ان افراد کی ضمانت کر دی مگر Cases کا تاحال کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔

سرگودھا کیس

8 سے 11 مارچ، 16 سے 26 مارچ 1986ء کو سرگودھا میں 26 احمدیوں کو کلمہ اپنے سینوں پر آویزاں کرنے کے "جرم" میں گرفتار کیا گیا۔ ناصر احمد جو ایک مقامی سکول میں استاد تھا کو احمدی ہونے کے شک کی بناء پر گرفتار کیا گیا۔ مسلمان "کٹھ ملا" سکول میں داخل ہوئے اور منیر احمد پر وحشیانہ حملہ کر دیا۔ پولیس نے اپنی آمد پر مسلمان مولویوں کو گرفتار کرنے کی بجائے منیر احمد اور ناصر احمد کو گرفتار کر لیا۔

ایک اور واقعے میں 65 سالہ ناصر احمد جو مقامی احمدیہ مسجد کے نگران تھے، کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا۔ مولویوں نے ان تمام لوگوں کو بھی مارا جو ناصر احمد کی مدد کو پہنچے تھے۔ مولویوں نے نگران احمدیہ مسجد کو پولیس سٹیشن تک گھسیٹا اور مزید پولیس سے بھی تشدد کروایا۔ دندان ساز اویس احمد کو مقامی مولویوں نے اس وقت اغواء کروایا۔ جب وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ مختلف دیگر واقعات میں کئی احمدیوں کو سرگودھا کی سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور پولیس کے حوالے کیا گیا۔ ان میں سے کئی کو بعض ایسی جگہوں پر محبوس کیا گیا جہاں پہ قانونی چارہ جوئی اور خاندان سے ملاقات پر مکمل پابندی تھی۔ عینی شاہدین نے اس کے علاوہ کئی ان لوگوں کو بھی جو قانونی طور پر رہا ہوئے، کو ضمانت کے فوراً بعد مسلمان انتہاپسندوں کے ہاتھوں پٹتے دیکھا۔

السلام علیکم کیس

روزنامہ جنگ (راولپنڈی) نے 6 جون 1984ء کو لکھا کہ کئی سو احمدیوں کو دوسرے لوگوں سے ملتے وقت "السلام علیکم" کہنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ پانچ جون 1984ء کو مانسہرہ میں ایک احمدی کو صرف لفظ "السلام علیکم" کہنے کی پاداش میں مقامی عدالت نے چھ ماہ کی قید بامشقت سنائی۔ ایف آئی آر کے مطابق ان تمام لوگوں کے خلاف مقامی مسلمانوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں نے مقدمات درج کروائے۔

مردان کیس

روزنامہ جنگ 19 ستمبر 1986ء کے مطابق مردان کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر شاہ حسین آفریدی نے دو احمدیوں کو فردا" فردا" پچاس ہزار روپے جرمانہ سنایا اور پانچ سال قید بامشقت سنائی۔ یہاں یہ بات

یاد رہے کہ آرڈیننس XX کے مطابق صرف 3 سال تک قید سنائی جا سکتی ہے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مقدمات

اگست 1986ء کو 9 احمدیوں کو کلمہ آویزاں کرنے کے "جرم" میں ٹوبہ ٹیک سنگھ جیل میں پابند سلاسل کیا گیا۔ 11 اگست 1986ء کو چار مزید افراد کو اسی طرح کے مقدمے میں گرفتار کر کے اندر کر دیا گیا۔

ستمبر 1986ء سرگودھا کیس

تین احمدیوں کو 2 سال قید بامشقت سنائی گئی۔ ان تین افراد کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے با آواز بلند کلمہ پڑھا تھا۔ سٹی مجسٹریٹ ظہیر خان نے ان افراد کو پی۔ سی۔ سیکشن 298-C کے تحت سزا سنائی

احمدی درزی کیس۔ پشاور

اس کیس کی ابتدا اس ایف آئی آر سے ہوتی ہے جو 9 ستمبر 1985ء کو ہشت نگری پولیس سٹیشن پشاور میں درج کرائی گئی۔ محمد ادریس جو درزی کا کام کرتا تھا' نے اپنی دوکان پر کلمہ آویزاں کیا تھا۔ اس کیس کا فیصلہ تقریباً ایک سال کے بعد ہوا جس کے مطابق محمد ادریس کو 10 ہزار جرمانہ اور 10 سال قید بامشقت سزا سنائی گئی۔ درجہ اول مجسٹریٹ خداداد خان مسعود نے اس غیر انسانی سزا پر یہ تو ضرور کہا کہ احمدی آرڈیننس XX کے تحت کلمہ Display نہیں کر سکتے مگر یہ بتانے سے قاصر رہے کہ سزا کو اتنے زیادہ سالوں پر کیوں محیط کیا۔

اس کارروائی کے لئے مولانا رحمت حدی' محمد امیر اور 35 علماء پیش پیش رہے۔ مولانا رحمت حدی نے زور دیا کہ دوسرے اسلام دشمن عناصر کو بھی اسی قسم کی سزائیں دی جائیں۔ فرنٹیئر پوسٹ کے مطابق 9 ستمبر 1986ء کو علماء نے بہت بڑے جلوس کی شکل میں احمدیوں کو سرعام پھانسی دینے کا مطالبہ کیا۔

احمدی مطبوعات اور احمدیوں کی ملاقاتوں پر پابندی

پاکستانی آئین اپنے شہریوں کو آئینی کتابوں کے صفحات پر ہر قسم کی مذہبی آزادی ودیعت کرتا ہے مگر احمدی مسلمانوں پر یہ آزادی "حرام" قرار دے دی گئی ہے۔

احمدی مسلمانوں کے حقوق کی آواز "الفضل" کو 12 ستمبر 1984ء میں زبردستی بند کر دیا گیا۔ روزنامہ جنگ (کراچی) 18 ستمبر 1986ء کے مطابق حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو احمدیوں کی تمام مطبوعات کی چھان بین کرے گی۔ کمیٹی کا سربراہ بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا عبدالقادر آزاد کو بنایا گیا جب کہ مذہبی امور کی کمیٹی کے چیئرمین حبیب الرحمان کو اس کمیٹی کا سیکرٹری بنایا گیا۔ احمدی نوجوانوں کے ماہنامہ رسالوں کو بھی بند کر دیا گیا۔ ماہنامہ خالد' انصار اللہ' مصباح' تشحیذ الاذھان اور کئی دوسرے رسالوں کو بند کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ احمدیوں کی کئی دیگر کتابوں اور قرآن پاک کے ترجمے پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے۔

احمدیوں پر ایک اور ظلم

اقوام متحدہ کے کیرل پارکر کے مطابق جب انہوں نے ربوہ کا دورہ کیا تو پتہ چلا کہ احمدی کہیں بھی سر عام عبادت نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی پبلک میٹنگ کر سکتے ہیں۔ ربوہ جو کہ 90 فیصد قادیانی افراد پر مشتمل ہے اور جہاں بہت سی احمدی مسجدیں بھی ہیں احمدی مذہبی امور سرانجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ قریبی مسجد کے نام نہاد مسلمان "شور و غل اور سکون میں دخل بازی" کا مقدمہ درج کرا دیتے ہیں۔

احمدیوں کے خلاف حکومتی اقدامات

حکومت پاکستان نے نہ صرف آرڈیننس XX کے تحت احمدیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا بلکہ احمدیوں کو حقیقی "اچھوت" سمجھتے ہوئے ہر شعبے میں ان کی حوصلہ شکنی کی۔ بلکہ احمدی دشمن عناصر کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ گورنمنٹ آفیسران باقاعدہ ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں جو احمدی مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ ریاست کا یہ بھیانک کردار دراصل اس بنیادی اصول کی تباہی کرتا ہے۔ جو سیکشن 153A پاکستان پینل کوڈ کے مطابق "جو کوئی بھی الفاظ' اعمال یا کسی بھی ذریعے سے مذہبی منافرت کو پھیلاتا ہے یا حوصلہ افزائی کرتا ہے کو پانچ سال قید کی سزا دی جائے گی۔"

عوامی تقریریں

7 دسمبر 1984ء کو جنرل ضیاء نے اپنی تقریر میں کہا "پاکستان میں دین کے منکروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اگر کسی کی عزت پر حملہ کیا جائے تو وہ قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔۔۔ اگر کوئی حضرت محمدؐ کے مقابلے میں آئے گا تو موت اس کا مقدر ہوگی"

اگست 1984ء میں ضیاء الحق نے ایک انٹرنیشنل کانفرنس کو یہ پیغام بھیجا۔

"آخری سالوں سے حکومت پاکستان نے کئی سماجی اور قانونی اقدامات اٹھائے ہیں جن کے تحت احمدیوں کو عام مسلمانوں کی طرح عبادت کرنے اور اعمال بجالانے سے روکنا سرفہرست ہے۔ ہم اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ "احمدی کینسر" کو ہمیشہ کے لئے جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔"

وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے 27 نومبر 1985ء کو کہا "کوئی بھی اپنے آپ کو حضرت محمدؐ کے بعد نبی ظاہر نہیں کر سکتا اور جو کوئی ایسا کرتا ہے یا یقین کرتا ہے ناقابل معافی سزا کا مستحق ہے۔"

فیڈرل شریعت کورٹ جس میں احمدی مسلمانوں نے آرڈیننس XX کو چیلنج کیا۔ ڈپٹی اٹارنی جنرل نے کہا "موت ان لوگوں کا مقدر ہے اور سزا ہے جو حضرت محمدؐ کو آخری نبی نہیں مانتے اور اسلامی ملکوں میں یہ بھیانک جرم ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس سلسلے میں گورنمنٹ ہی اقدامات کرے بلکہ کوئی بھی باغیرت مسلمان قانون کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔"

جنوری 1986ء کو ایک ٹیلی ویژن نشریئے میں علامہ طاہر القادری نے کہا "جو کوئی نبی آخر الزمانؐ کو نہیں مانتا بلا امتیاز قتل کر دیا جانا چاہئے۔"

طاہر القادری نے مزید کہا

"شہریوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس معاملے میں وہ گورنمنٹ ہی سے رجوع کریں بلکہ وہ خود بھی اقدامات کر سکتے ہیں۔"

ایک اور جگہ پر اٹارنی محمد اسمٰعیل قریشی نے پاکستان بار ایسوسیشن سے مطالبہ کیا کہ احمدی وکلاء کو Dis-Barred کیا جائے۔

احمدیوں کے خلاف حلف بازی

مذہبی غیر رواداری اور غیر انسانیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو پاکستانی آئین میں امتیازی قوانین کی حیثیت سے موجود ہیں۔ حکومت پاکستان اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ ایک شہری کو ملازمت حاصل کرنے یا پاسپورٹ حاصل کرنے سے احمدی نہ ہونے کا حلف اٹھانا پڑے گا۔

احمدیوں کا قتل عام

احمدیوں کے خلاف پاکستانی ریاست کی مہم کا یہ سیاہ باب ہے کہ صرف دو مہینوں میں یعنی 1984ء میں 12 احمدیوں کو قتل کیا گیا۔ 11 مئی 1986ء کو دن دہاڑے سکھر کی سڑکوں پر قمر الحق اور کالص سلیمان کو چاقوؤں اور چھریوں سے قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ قتل عام کی ایک چھوٹی فہرست یہ ہے۔

1- اپریل 1983ء کو عبدالکریم ابرو کو قتل کر دیا گیا اور کوئی بھی گرفتاری عمل میں نہ آئی

2- مہراب پور میں اپریل 1984ء کو احمدی کمیونٹی کے صدر کو قتل کر دیا گیا اور کوئی بھی اس جرم میں گرفتار نہ ہوا۔

3- احمدی کمیونٹی سکھر کے صدر عبدالرحمان قریشی کو قتل کر دیا گیا۔

4- 28 جنوری 1985ء کو سکھر میں نامور احمدی وکیل نجم الحق کو قتل کر دیا گیا۔

5- 15 مارچ 1985ء کو رحمان انور کو سکھر میں قتل کر دیا گیا۔

6- احمدی کمیونٹی نواب شاہ کے صدر عبدالرزاق کو 7 اپریل 1985ء کو قتل کر دیا گیا اور کوئی بھی گرفتاری عمل میں نہ لائی گئی۔

7- 9 جون 1985ء کو ڈاکٹر عقیل بن عبدالقدیر کو حیدر آباد میں قتل کر دیا گیا۔

8- 18 ستمبر 1985ء کو شیخ ناصر احمد کو اوکاڑہ میں قتل کر دیا گیا۔

9- 16 جون 1984ء کو حیدر آباد میں ڈاکٹر عبدالقدیر کو سرعام قتل کیا گیا۔

10- 28 نومبر 1984ء کو رانا سلطان محمود کو جہلم میں قتل کر دیا گیا۔

11- 24 اپریل 1985ء کو خیرپور میں احمدی کمیونٹی کے صدر چوہدری منور احمد کو قتل کر دیا گیا۔

12- 28 فروری 1985ء کو سکھر میں ایک احمدی انور احمد کو قتل کر دیا گیا۔

ملازمتوں میں امتیاز

امتیازی برتاؤ کا ظلم احمدیوں کے خلاف زندگی کے ہر شعبے میں برتا جا رہا ہے۔ انہیں ملازمتوں سے برطرف کیا جانا، ملازمتیں نہ دینا بہت معمول کی بات ہے۔ کیرن پارکر کے مطابق

* 4 مارچ 1985ء کو جے۔ ایم۔ ناصر (پاکستان ایئر فورس) نے احمدی نوجوانوں کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"اس بات کی اطلاع ملی ہے کہ آپ لوگوں نے اسلام چھوڑ کر احمدیت اختیار کر لی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ حکومت احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے چکی ہے۔ اس اقدام سے آپ نے مذہبی تفریق اور منکریت کی ابتداء کی ہے۔ لہٰذا آپ لوگوں کے خلاف انتہائی اقدامات کے علاوہ ملازمتوں سے بھی برطرف کیا جائے گا۔"

* 24 جون 1984ء کو سیکشن آفیسر طلعت حسین (اری گیشن اینڈ پاور ڈیپارٹمنٹ نے چیف انجینئرز کو ہدایت کہ وہ "احمدیوں" کی نشاندہی کریں اور اعلیٰ حکام کو رپورٹ دیں۔
* 6 جون 1984ء کو اسسٹنٹ کمشنر (صدر) بی۔ اے فاروقی نے ایک ملازم کو حکم دیا کہ ایک احمدی کو ملازمت سے برطرف کیا جائے اور "تعمیل حکم" کی رپورٹ ڈپٹی کمشنر ڈی۔ جی خان کو بھیجی جائے۔
* 15 اپریل 1986ء کو ہائی کورٹ سندھ کراچی ڈسٹرکٹ اور سیشن ججز کو حکومتی خط ملا جس کے مطابق انہیں وہ فہرستیں مہیا کرنی ضروری تھیں جس سے اندازہ لگ سکے کہ صوبے میں کتنے احمدی ملازمین کام کر رہے ہیں۔
* حال ہی میں شمالی مغربی سرحدی صوبے کی پارلیمنٹری اسمبلی نے ایک کمیٹی بنائی جس نے صوبے میں احمدی ملازمین پر کڑی نظر رکھنی ہے۔

احمدی مسجدوں پر حملے اور تباہیاں

ریاست کی مدد سے احمدی مسجدوں پر حملے اور گرانے کا عمل بغیر کسی روک ٹوک کے جاری ہے۔

* 1984ء میں کوئٹہ میں ایک احمدی مسجد کو حملے کر کے بعد میں گرا دیا گیا۔

* 9 مئی 1986ء ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ انور سلیم احمد کے مطابق 700 سے زائد لوگوں (مولویوں کا ہجوم ایک احمدی مسجد پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا جب کہ حکومت نے زبردستی احمدیوں کو منایا کہ وہ یہ مسجد گورنمنٹ کے حوالے کر دیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ حملہ کرنے والے تمام مولوی پولیس کی مدد سے یہ کام کرتے رہے۔ جب کہ وہ معصوم احمدی جو مسجد میں عبادت کرنے میں مصروف تھے گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی تعداد 85 تھی جب کہ پانچ شدید زخمیوں میں سے ایک بعد میں چل بسا۔
* وسط اگست 1986ء کو مردان میں عوام کے ایک ہجوم نے پولیس اور اسسٹنٹ کمشنر کی مدد سے مقامی احمدی مسجد پر حملہ کر دیا۔ 90 احمدی جو نماز عید ادا کر رہے تھے کو گرفتار کر لیا گیا۔ حملہ آور صبح 8 بجے سے لے کر شام 5 بجے تک ریاستی پولیس کی نگرانی میں جلاؤ گھیراؤ، توڑ دو اور لوٹو کی پالیسی پر عمل کرتے رہے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے بین الاقوامی ترجمان مولانا عزیز الرحمان نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ کے ساتھ ایک معاہدہ طے پا گیا ہے جس کے مطابق مسجد دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور یہ کہ حکومت تباہی پھیلانے اور مسجد گرانے والوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ بشمول ان قومی و صوبائی اسمبلی کے ممبران نے جنہوں نے اس میں حصہ لیا۔

اس طرح کے کئی اور واقعات کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر

* 4 مئی 1984ء کو گجرات میں پولیس کی بھاری نفری کی موجودگی میں 200 لوگوں کے ہجوم نے ایک احمدی مسجد کو بند کر دیا۔ بعد میں یہ مسجد مقامی "کٹھ ملاؤں" کے حوالے کر دی گئی۔
* اس کے علاوہ نواب شاہ، سکرنڈ اور مورو میں بھی احمدی مساجد غیر احمدی "مسلمانوں" کے حوالے کر دی گئیں۔

غرضیکہ پوری ریاست میں احمدیوں کی عزت، عقیدے، جان و مال، جائیداد، عزت نفس اور انسانی آزادی محفوظ نہیں اور دکھ دہ بات یہ ہے کہ اس پوری غیر انسانی اور غیر اخلاقی مہم میں ریاست بندوقیں لئے مولویوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے رہی ہے۔

باب 6

سیاسی محرومیاں

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد جداگانہ انتخابات کے اصول پر کی تھی۔ یعنی ایک مذہبی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد صرف اپنے عقیدے سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کو ووٹ دیں گے۔ یہ اصول بھی جماعت احمدیہ کے خلیفہ کا تجویز کردہ تھا۔ ایک وسیع ملک ہندوستان جہاں پر اقلیتوں کی تعداد کل آبادی کا 25 فیصد تھی ایک مختصر مدت کے لئے اس کا کوئی جواز نکالا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ امر قابل توجہ ہے کہ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ اقلیتی گروہوں نے اکثریتی آبادی سے تحفظ کے لئے کیا تھا۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد جداگانہ طرز انتخاب کے تسلسل یا مخلوط طریق کے مسلمہ جمہوری اصول کی بحالی کا مسئلہ جمہوریت پسند اور رجعت پسند قوتوں کے درمیان کشمکش کی علامت بن کر رہ گیا۔

1970ء سے 1977ء کے انتخابات مخلوط بنیادوں پر منعقد ہوئے۔ لیکن 1980ء کی دہائی کے شروع میں اس وقت کی فوجی حکومت کی اسلامائزیشن کی مہم کے نتیجہ میں نئے سرے سے جداگانہ انتخابات کا اصول متعارف کرایا گیا جو کہ سراسر "ملا مافیا" اور ڈکٹیٹر ضیاء الحق کی سوچ کا نتیجہ تھا۔ جو 1977ء سے اب تک احمدیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے تھے اور اب ان کے سیاسی حقوق کو بھی پامال کرنے کے درپے تھے۔ ان جداگانہ انتخابات کے سلسلہ نے پاکستان کے سماج پر تباہ کن اثرات مرتب کئے۔

اس انتخابی نظام نے آبادی کے اقلیتی حصے بشمول احمدیوں کو سیاست اور سماج کے بڑے دھارے سے الگ کر دیا۔ جب کہ جماعت احمدیہ نے جداگانہ نظام کو مسترد کرتے ہوئے 1980ء سے

لے کر 1998ء تک ان انتخابات کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔

اس جداگانہ انتخابی نظام سے مذہبی "ملا مافیا" کا مفروضہ صحیح ثابت ہوا کہ پاکستان کی غیر مسلم آبادی بشمول احمدیوں کے پاکستان کے مساوی اور یکساں شہریت کے حامل نہیں بلکہ ایک اضافی اور غیر ضروری "اچھوت قوم" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جداگانہ انتخاب کے اصول کے نتیجہ میں ملک کی تمام سیاسی جماعتیں احمدیوں سمیت تمام اقلیتوں کی حیثیت اور ان کی ترقی کے بارے میں لاپرواہی کا شکار ہو گئیں۔ کیوں کہ اب اقتدار میں آنے کے لئے سیاسی جماعتوں کو اقلیتی عوام کی حمایت کی ضرورت پیش نہیں آتی اور قومی اسمبلی میں دس سے کم اقلیتی ارکان قانون سازی میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔ جس کی مثال 295-C، 298-C، 298-B اور اس نوعیت کے کئی دوسرے قوانین ہیں جو ان اقلیتی ارکان کی موجودگی میں پارلیمنٹ سے منظور ہوئے مگر ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کے مصداق ثابت ہوئی۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر جماعت احمدیہ نے جداگانہ نظام انتخاب کو قبول کرنے سے ابتداء میں ہی انکار کر دیا تھا۔

پاکستان میں اس جداگانہ نظام انتخاب کے نفاذ کے بعد احمدیوں کی سیاسی حیثیت اور سماجی حیثیت کلیتہً ختم ہو چکی ہے اور ان کی حیثیت اس کوڑے کی مانند ہو چکی ہے جو کہ ری سائیکلنگ کے پراسس کے قابل بھی نہیں۔ ان کی آزادی فکر و ضمیر اور قومی معاملات میں رائے کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی ان کے سماجی و سیاسی حقوق کی ضمانت ہے۔

1994ء میں بے نظیر حکومت نے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد ملک میں بعض انتخابی اصلاحات نافذ کرنے کا فیصلہ کیا جس کا مقصد پاکستان کی آبادی کے اقلیتی حصے کے حقوق کا تحفظ اور انہیں سیاسی اور بڑے سماجی دھارے میں شامل کر کے ان کی صلاحیتوں کو قوم و ملک کے مفاد میں زیر استعمال لانا تھا۔ مگر جونہی پیپلز پارٹی کی حکومت کی جانب سے اس تجویز کا انکشاف ہوا پورے ملک میں ملا مافیا نے طوفان بدتمیزی کھڑا کر ڈالا۔ حکومت کا موقف یہ تھا کہ اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دیا جانا چاہئے تاکہ وہ قومی معاملات کو حل کرنے کے لئے بہتر قیادت کا انتخاب کر سکیں اور یوں سیاسی جماعتوں میں ان کی 80 سے پہلی والی حیثیت بحال ہو سکے۔ اتنا اعلان ہونا تھا کہ مذہب کے پیشہ ور

موالیوں نے امن پسند راگ الاپنے شروع کر دیئے اور کہا گیا کہ جداگانہ انتخابات پاکستان کی اساس تھے۔ حالانکہ نظریہ پاکستان تو صرف تین نعروں پر مشتمل تھا۔ ○ ہندوستان سے علیحدگی ○ عوام کی حاکمیت ○ مفاد عامہ پر ترجیحی توجہ

اب اگر کسی نظریے کو جداگانہ انتخابات سے جوڑا جا سکتا ہے تو وہ نظریہ ضرورت تھا اور نظریہ ضرورت کسی قوم کا ابدی نظریہ نہیں بن سکتا۔ حالانکہ آج جو آئین رائج ہے اس کی رو سے غیر مسلموں بشمول احمدیوں کو مسلمان نشستوں پر امیدواروں کو ووٹ دینے کا حق ہے۔ مگر ایسا کرنے سے ملک میں موجود خلیفہ آمریت ضیاء الحق کے ارشادات پر زد آ سکتی ہے جو کہ "ملا مافیا" کے مفادات کو ڈائریکٹ نشانہ بناتی ہے۔

پاکستان میں احمدی کمیونٹی جس سیاسی و سماجی استحصال کا شکار ہے شاید ہندوستان میں موجود مسلمان بھی ایسے مسائل کا شکار نہیں کیوں کہ ان کو سیاسی احتجاج اور اپنے فکر و ضمیر کے اظہار کی آزادی حاصل ہے۔ مگر یہاں معاملہ بالکل الٹ نظر آتا ہے۔

ضمیمہ 1

عبادت گاہوں پر حملے، تشدد اور گرفتاریاں

متاثرہ شخص۔علاقہ و تھانہ	نوعیت تشدد و کیس	تاریخ	سزا اگر ہوئی
1-ریاض احمد لاہور	جسمانی تشدد	14 اکتوبر 1984ء	
2-دو احمدی لڑکیاں	سکول میں داخلے سے روک دیا گیا	15 اکتوبر 84ء	
3-ایک احمدی نوجوان	زدوکوب	13 اکتوبر 84ء	
-4	احمدیہ سنٹر گوجرانوالہ پنجاب پر حملہ	6 اکتوبر 84ء	
5-ایک احمدی آفیسر	خفیہ اہلکاروں کی دھمکیاں	12 اکتوبر 84ء	
6-سلطان احمد سمبڑیال ڈسٹرکٹ سیالکوٹ	معاشرتی بائیکاٹ	10 اکتوبر 84ء	
7-دو احمدی طلباء تھرپارکر، سندھ	داخلے سے محروم کر دیا گیا۔	20 اکتوبر 84ء	
8-گونگا احمدی بچہ تھرپارکر، سندھ	مارشل لاء کورٹ میں مقدمہ بغیر کسی وجہ کے	17 اکتوبر 84ء	
9-ربوہ مساجد کیس	املاک پر قبضہ۔		

املاک یہ ہیں:

1-احمدی بین الاقوامی خواتین تنظیم

2- " " بچوں کی تنظیم — 20اکتوبر84ء

3- " " نوجوانوں کی "

4- " " بوڑھوں " "

کے دفاتر شامل ہیں

10-پنوں عاقل، ضلع سکھر کی ایک احمدی فیملی کا بچہ رفیق احمد	سکول میں ہزیمت کا نشانہ بنایا گیا۔	17اکتوبر84ء	
11- سمن گلی بلوچستان داؤد احمد	پاکستان ایئر فورس پولیس نے گرفتار کیا۔ وجہ کوئی نہیں۔	18اکتوبر84ء	ایک مہینہ تک تشدد کیا
12-احمدی معصوم بچے رحیم یار خاں سکول	پانی پینے سے روک دیا گیا۔	20اکتوبر84ء	
13-احمدیہ نوجوانوں کی تنظیم کا سربراہ میرپور آزاد کشمیر	معاشرتی بائیکاٹ	21اکتوبر84ء	مستقل بائیکاٹ
14-حسیب احمد ضلع نواب شاہ، سندھ	مذہبی بحث کے دوران تشدد کیا گیا۔	22اکتوبر84ء	
15-سید نیاز احمد شاہ ربوہ	تبلیغ کرنے کے جرم میں گرفتاری اور تشدد	24اکتوبر84ء	6ماہ
16-حضرت مرزا طاہر احمد چنیوٹ، ربوہ	بی-بی-سی کو دیا گیا انٹرویو	27اکتوبر84ء	کیس تاحال چل رہا ہے

17-مرزا سلطان احمد	شدید جسمانی تشدد	29اکتوبر84ء	
میڈیکل کالج، فیصل آباد			
18-احمدی طلباء	میڈیکل کالج خالی کرا	30اکتوبر84ء	
میڈیکل کالج، فیصل آباد	دیا گیا۔		
19-عابد احمد	دھمکیاں+ ہراساں	30اکتوبر84ء	
پنجاب یونیورسٹی، بزنس			
ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ			
20-سید صادق شاہ	بلاجواز گرفتاری، تشدد	1اگست84ء	
ضلع ہزارہ			
21-سرگودھا، پنجاب	احمدی کے گھر ایک لاش	3اگست84ء	باعزت بری
	پھینکی گئی+ گرفتار کیا گیا		
22-سات احمدی عورتوں اور	زمین پر قبضہ	4اگست84ء	
جوانوں کے خلاف مقدمہ		30جولائی84ء	
23-منیر احمد، کراچی	کار پر پیچھا+ فائرنگ		
24-خان محمد بلوچ	جسمانی تشدد رشتے داروں	5اگست84ء	
ضلع تھرپارکر، سندھ	نے کیا۔		
25-ایک احمدی ڈاکٹر	احمدی کیمسٹ شاپ کی جگہ	6اگست84ء	
ٹنڈو جام، سندھ	"کافر کیمسٹ شاپ" لکھا گیا		
26-احمدی ٹھیکیدار	پستول سے فائرنگ کی گئی	6اگست84ء	
ضلع خیرپور، سندھ			
27-خورشید احمد اور حاجی	اذان پڑھنے کی وجہ سے	7اگست84ء	
محمد یوسف۔ ضلع ہزارہ			
صوبہ سرحد			

28-احمدی کمیونٹی میرپور، آزاد کشمیر	معاشرتی بائیکاٹ+مولویوں کی نفرت انگیز تقریریں	اگست 84ء
29-احمدیہ مرکز سیالکوٹ، پنجاب	مرکز پر پولیس کا چھاپہ +سخت نگرانی	2 اگست 84ء
30-پانچ سالہ احمدی لڑکی ضلع ہزارہ، صوبہ سرحد	پتھر مار کر لہولہان کر دیا گیا۔	9 اگست 84ء
31-عبدالسمیع، لاہور	پٹرول سٹیشن پر نامعلوم موٹر سائیکل سواروں کی اندھادھند فائرنگ	
32-احمدیہ مرکز سیالکوٹ، پنجاب	خفیہ والوں کا چھاپہ اور مطبوعات قبضہ میں لے لیں	7 اگست 84ء
33-احسان اللہ چیمہ لالیاں، ربوہ	بلاجواز گرفتاری	7 اگست 84ء
34-احمدی سیلزمین فیصل آباد، پنجاب	غیر قانونی گرفتاری	13 اگست 84ء
35-حافظ محمد اسمٰعیل سیالکوٹ، پنجاب	گندگی کا ڈھیر پھینکا گیا	14 اگست 84ء
36-پانچ احمدی داتا، ضلع ہزارہ، سرحد	عدالتی کارروائی سنتے ہوئے گرفتار کئے گئے۔	13 اگست 84ء
37-ایک احمدی ملازم	نوجوانوں نے بیگ کی تلاشی لی	14 اگست 84ء
38-طارق بٹ ضلع سیالکوٹ	مسلم یوتھ فورس نے دوکان لوٹنے کی دھمکی دی	15 اگست 84ء

39-محمد حنیف گکھڑ، ضلع گوجرانوالہ	داخلہ میں غیر مسلم اقلیتی نشست دی گئی۔	
40-انور حسین ساجد، سلطان احمد نصیر احمد اورنگی ٹاؤن، کراچی	مولویوں نے بغیر وجہ کے رپورٹ درج کروائی	16 اگست 84ء
41-محمد یعقوب اورنگی ٹاؤن، کراچی	اغوا کر لیا گیا۔	
42-فضل دین باجوہ	بلا جواز مقدمہ، گرفتاری	17 اگست 84ء
ڈاکٹر راشد، پرویز احمد رحیم یار خان، پنجاب	B/298 پینل کوڈ	16 اگست 84ء
43-تین احمد صادق آباد، رحیم یار خان		
44-منصور احمد خوشاب، پنجاب	بلا جواز مقدمہ	19 اگست 84ء
45-ایک احمدی نوجوان غازی آباد، ضلع ساہیوال	ہزیمت کا نشانہ بنایا گیا+مقدمہ	21 اگست 84ء
46-احمدی ملازم سیالکوٹ، پنجاب	قاتلانہ حملہ+=/9200 روپے کی چوری	23 اگست 84ء
47-احمدی کمیونٹی مہہ دیوی، شیخوپورہ	آرمی کے سپاہیوں نے احمدیوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں	24 اگست 84ء
48-احمدی محلّہ کوئٹہ، بلوچستان	پورے علاقے کو نذر آتش کرنے کی سازش کا انکشاف	
49-احمدی کمیونٹی	معاشرتی بائیکاٹ	24 اگست 84ء

ضلع ملتان، مہدی رتہ		
50-بشیر احمد	رات کے اندھیرے میں	27اگست84ء
سیالکوٹ، پنجاب	قاتلانہ حملہ	
51-احمدی سردار	مالی نقصان	30اگست84ء
کوٹ عیسیٰ جان، ضلع جھنگ		
52-احمدی کمیونٹی	نماز کے دوران پتھروں	28جون84ء
شیخ محمدی، پشاور	سے حملہ	
53-پروفیسر مسز رضیہ	نائب پرنسپل کی حیثیت سے	27جون84ء
چونیاں، ضلع قصور	کام کرنے سے روک دیا گیا	
54-احمدیہ سنٹر	آگ لگانے کی سازش پکڑ	29جون84ء
ربوہ	لی گئی۔	
55-چنیوٹ نزد ربوہ	لوکل عدالت پر مولویوں کا حملہ	30جون84ء
پنجاب	اور عدالت کو احمدیوں کے حق	
	میں فیصلہ دینے سے روکنے کی	
	کوشش کی گئی۔	
56-ناصر احمد	ہجوم کا حملہ اور دوکان لوٹ	30جون84ء
چنیوٹ	لی گئی۔	
57-احمدیہ سینٹر	قیمتی نوادرات کی چوری	3جولائی84ء
تخت ہزارہ، ضلع سرگودھا		
58-احمدیہ مرکز	احمدیہ مرکز پر قبضے کی کوشش	3جولائی84ء
مانو نگر، ضلع لاہور		
59-چودھری محمد عیسیٰ	گھر کو آگ لگانے کی کوشش	6جولائی84ء
گجرات، پنجاب		

60-حافظ محمد احمد سرگودھا	تشدد+انتقام کانشانہ	8جولائی84ء
61-مبارک اور وسیم ربوہ' پنجاب	گرفتاری	8جولائی84ء
62-احمدیہ کمیونٹی جھنگ' پنجاب	گوریلافورس کاقیام تاکہ احمدیوں کولوٹااور قتل کیاجاسکے۔	9جولائی84ء
63-احمدی سمبڑیال' ڈسٹرکٹ فیصل آباد	سینوں نے سنی نوجوانوں میں احمدیوں کے خلاف استعمال کے لئے اسلحہ تقسیم کیا۔	10جولائی84ء
64-عبداللطیف عیسیٰ خیل ،ضلع میانوالی پنجاب	قاتلانہ حملہ	
65-چودھری محمد بوٹا ضلع ساہیوال	زمینوں کی سیرابی کاپانی روک دیا گیا۔	14جولائی84ء
66-اظہر نوید فیصل آباد' پنجاب	پی۔ایم۔اے سے احمدی ہونے کی بناپر نکال دیا گیا۔	15جولائی84ء
67-ایک قصاب فیصل آباد' پنجاب	معاشرتی بائیکاٹ	16جولائی84ء
68-احمدیہ مرکز لاہور	نوجوانوں کاگنوں سے سنٹر پر حملہ	17جولائی84ء
69-بارہ سالہ لڑکا	انتہاپسندوں نے گردن توڑدی	20جولائی84ء
70-سلطان احمد	غیر قانونی گرفتاری	20جولائی84ء

ضلع تھرپارکر، لطیف نگر		
71-احمدیہ مرکز	بارہ بچوں کا احمدیہ مرکز پر	21جولائی84ء
میرپور خاص، تھرپارکر سندھ	حملہ اور پتھراؤ	
72-تین احمدی نوجوان	بلاجواز گرفتاری	21جولائی84ء
گجرات، پنجاب		
73-محمد یوسف	بلاجواز جسمانی تشدد	22جولائی84ء
ضلع سرگودھا		
74-خلیفہ قاسم	سنگین نتائج کی دھمکیاں	22جولائی84ء
ضلع بدین، سندھ		
75-سید شفیق احمد	سپرنٹنڈنٹ پولیس نے طلب	23جولائی84ء
سیالکوٹ، پنجاب	کیا اور پوچھ گچھ کی۔	
76-سید بشیر شاہ	بلاجواز گرفتاری	31جولائی84ء
سید صادق شاہ		
پھاگلہ، ضلع ہزارہ		
77-ربوہ	لاؤڈ سپیکر کا استعمال ممنوع	23 مئی84ء
	قرار دے دیا گیا۔	
78-احمدیہ کمیونٹی	پوری کمیونٹی کو پانی کی	26 مئی84ء
ٹوبہ ٹیک سنگھ	سپلائی روک دی گئی۔	
79-احمدی نوجوان	احمدیہ سنٹر پر ڈیوٹی کے دوران	29 مئی84ء
اسلام آباد	پتھروں سے لہولہان کر دیا گیا۔	
80-ضلع گجرات، پنجاب	احمدی آبادی کا پانی روک دیا گیا	29 مئی84ء
81-احمدیہ مرکز	مذہبی انتہاپسندوں نے احمدیہ	29 مئی84ء
ضلع گوجرانوالہ	مرکز پر قبضہ کر لیا۔	

82-ایک احمدی کی جائیداد	آگ لگادی گئی	30مئی84ء
کماس، ضلع لاہور		
83-انوار الحق، بشارت	لٹریچر تقسیم کرنے پر گرفتار	30مئی84ء
کرلیا گیا۔		
84-عبدالباقی	موٹر سائیکل پر تین نوجوانوں نے	28مئی84ء
اسلام آباد	قاتلانہ حملہ کرکے شدید	
	زخمی کردیا۔	
85-مرزا طاہر احمد	بی۔بی۔سی کو دیئے گئے انٹرویو	3جون84ء
لندن	کے خلاف رپورٹ درج کرائی گئی	
86-فضل الرحمان، مبارک احمد	مسلمان کہنے کے جرم میں مقدمہ	4جون84ء
ضلع نواب شاہ	درج کرایا گیا۔	
87-احمدی ملت	راجہ ظفر الحق نے احمدیوں کے	5جون84ء
اسلام آباد	خلاف تقریر کی۔	
88-کرم اللہ	اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے	8جون84ء
مانسہرہ صوبہ سرحد	پر گرفتار کیا گیا۔	
89-ناصر احمد جوجہ	احتجاجی و پر تشدد جلوس	9جون84ء
میرپور، آزاد کشمیر		
90-ایک احمدی ملازم	تنگ کیا جارہا ہے اور کنٹین	10جون84ء
ایبٹ آباد، صوبہ سرحد	سے چائے نہیں پینے دی جارہی	
91-احمدی طالبعلم	زبردست تشدد کا نشانہ اور نازیبا	10جون84ء
ڈاؤ میڈیکل کالج، سندھ	الفاظ کہے گئے۔	
92-احمدیہ کمیونٹی	جمعہ کی نماز ادا کرنے سے روک	11جون84ء
منڈیالہ وڑائچ گوجرانوالہ	دیا گیا اور اذان و نماز کے	

پنجاب	اجتماع پر پابندی لگادی گئی	
93-شاہ محمد	دھمکیاں+احمدیت ترک کرنے	9جون84ء
لوروپل، ضلع قصور	کا حکم	
94-احمدیہ کمیونٹی	مقامی مولوی نے تمام احمدیوں کے	10جون84ء
ربوہ	قتل کا فتویٰ جاری کردیا۔	
95-احمدیہ مطبوعات	احمدیہ کتب حکومت نے قبضہ میں	11جون84ء
کوئٹہ، بلوچستان	لے لیں اور جامہ تلاشی	
96-احمدیہ کمیونٹی	احمدیوں کے خلاف وزارت مذہبی	18جون84ء
پاکستان	امور نے کتاب چھاپی۔	
97-احمدیہ مراکز	احمدیہ مراکز پر پتھروں سے حملہ	19جون84ء
ضلع گجرات، عالم گرہ		
98-راشد عالم	ملازمت سے نکال دیا گیا	20جون84ء
مانسہرہ صوبہ سرحد		
99-احمدی	حملہ اور تشدد	22جون84ء
لالیاں، ربوہ		
100-نفیس احمد، اظہر محمود	خارج کردیا گیا	مئی84ء
بہاولپور میڈیکل کالج		
101-سردار احمدیہ بوتھ	گرفتار کردیا گیا	3مئی84ء
رحیم یار خان		
102-احمدیہ مرکز	حملے کی سازش تیار	5مئی84ء
ٹوبہ ٹیک سنگھ		
103-احمدی ملت	ملتان کی تمام مساجد میں	6مئی84ء
ملتان، پنجاب	احمدیوں کے خلاف اشتعال انگیز	

	تقریریں	
104-احمدی ملت لاہور	لاہور کی کئی مساجد میں احمدیوں کے قتل عام کے مطالبات کئے گئے	4 مئی 84ء
105-احمدیہ مسجد گجرات، پنجاب	300 افراد نے حملے کے بعد قبضہ کر لیا۔	3 مئی 84ء
106-پانچ احمدی رحیم یار خان	گرفتار کر لئے گئے	3 مئی 84ء
107-احمدیہ سنٹر اسلام آباد	آگ لگانے کی کوشش	8 مئی 84ء
108-ڈاکٹر تنویر سیالکوٹ	تشدد اور گرفتاری	13 مئی 84ء
109-احمدیہ مساجد بدین، سندھ	انتظامیہ کی طرف سے مساجد کے محراب گرانے کا حکم	14 مئی 84ء
110-تین احمدی سولجر، ہزارہ	گرفتار+ٹارچر	15 مئی 84ء
111-چار احمدی احمد نگر، ضلع جھنگ	گرفتار	21 مئی 84ء
112-چار احمدی قصور، پنجاب	گرفتاری بلاجواز	21 مئی 84ء
113-بشیر احمد عمرکوٹ، ضلع خیرپور	گرفتاری بلاجواز	23 مئی 84ء
114-احمدی طلبا ملتان	داخلے سے محروم کردیا گیا	23 مئی 84ء

115-احمدیہ کمیونٹی راجن پور	معاشرتی بائیکاٹ	23 مئی 84ء
116-تین احمدی راجن پور، پنجاب	زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا	23 مئی 84ء
117-ایک احمدی پنوں عاقل	قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گیا۔	26 مئی 84ء
118-ربوہ، پنجاب	بدنام زمانہ ملا اللہ یار ارشد نے احمدیوں کے خلاف ایک جلوس کی قیادت کی۔	26 نومبر 84ء
119-مرزا طاہر احمد چنیوٹ، نزد ربوہ	مرزا طاہر احمد پر شدید طعنہ زنی	25 نومبر 84ء
120-عبدالغنی اور دو بیٹے ربوہ	بلاجواز گرفتاری	26 نومبر 84ء
121-ربوہ جھنگ، پنجاب	ایک درخواست جس میں ربوہ کا نام تبدیل کرنے کی درخواست کی گئی	13 نومبر 84ء
122-کوئٹہ بلوچستان	نواب اکبر بگٹی نے احمدیوں کی حمایت میں بیان دیا (نوائے وقت)	11 نومبر 84ء
123-احمدیہ کمیونٹی ربوہ	مارشل لاء کورٹ میں عبادت سے روکنے کی درخواست دائر کی گئی	1 نومبر 84ء
124-میاں محمود احمد ملتان	کلمہ بیج آویزاں کرنے پر کیس میں الجھا دیا گیا۔	23 دسمبر 84ء
125-احمدیہ کمیونٹی چاک گروٹ ضلع خوشاب، پنجاب	مولویوں نے لعن طعن کی اور گالیاں دیں۔	24 دسمبر 84ء

126-خان محمد ڈی.جی خان پنجاب	سیکشن C-298 کے تحت مقدمہ درج کرایا گیا۔	ا دسمبر85ء
127-احمدی عوام پاکستان	92ویں سالانہ اجتماع سے روک دیا گیا۔	27دسمبر85ء
128-ربوہ احمدیہ سیکرٹریٹ	مولویوں کا ربوہ کی سڑکوں پر احمدیوں کے خلاف نازیبا مارچ	10دسمبر85ء
129-احمدی ڈی.جی خان پنجاب	احمدیوں کے خلاف کئی کیس دفعہ C-295 کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔	15دسمبر85ء
130-محمد یاسین' احمدی مربی گوجرانوالہ	دفعہ C-298 کے تحت گرفتار	23دسمبر85ء
131-ڈاکٹر عبدالحمید گوٹھ غلام محمد	شدید قاتلانہ حملہ جس میں سینے اور بازوؤں وغیرہ پر شدید چوٹیں آئیں	26دسمبر85ء
132-احمدی ملت پاکستان	قتل کیا جائے	13دسمبر85ء
133-چھ احمدی اوکاڑہ پنجاب	ضمانتیں منسوخ کر دی گئیں	2.7دسمبر85ء
134-احمدیہ کمیونٹی چنیوٹ نزد ربوہ	احمدیوں کو سرعام قتل کیا جائے	30دسمبر85ء
135-منیر احمد عابد گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ	کلمہ پہننے کی پاداش میں 1سال قید بامشقت	16جنوری86ء
136-سردار امیر محمد خان مرحوم	مرحوم کی لاش کو پانچ دن بعد	22جنوری86ء

ڈی.جی خان، کوب کیسرانی	انتہاپسندوں نے قبر سے نکال پھینکا	
137- چنیوٹ، پنجاب	احمدیوں کو لاؤڈ سپیکر کے استعمال کی اجازت واپس لے لی گئی۔	24جنوری 86ء
138- ڈی.جی خان، پنجاب	طلبا کو مولویوں نے احمدیوں کے خلاف اکسایا اور اشتعال انگیز جلوس	26جنوری 86ء
139- احمدیہ عبادت گاہ ڈسٹرکٹ بدین، گولارچی، سندھ	اشتعال انگیزوں نے عبادت گاہ کو شہید کردیا۔	7مئی 86ء
140- احمدیہ عبادت گاہ بلوچستان	پولیس کی مدد سے مولویوں نے احمدیہ مسجد اور املاک پر قبضہ کرلیا۔	9مئی 86ء
141- منیر احمد ملتان پنجاب	حراست میں لے لیا گیا	14مئی 86ء
142- ساہیوال	احمدیوں کے خلاف جماعت اسلامی اور تنظیموں کا مشترکہ اجلاس، قتل عام کی سازش	16مئی 86ء
143- محمد احمد ضلع جھنگ	حراست و تشدد	22مئی 86ء
144- قاضی احمد نواب شاہ سندھ	دوکان پر حملہ، توڑ پھوڑ اور تشدد	13فروری 88ء
145- سرور احمد لاڑکانہ سندھ	سکول ماسٹر تھا جسے دباؤ کے تحت تبدیل کردیا گیا۔	28جنوری 88ء
146- محمد بوٹا مرحوم ضلع ساہیوال، پنجاب	قبر سے لاش باہر پھینک دی گئی	17فروری 88ء
147- شیخ محمد اسلم	پولیس نے حراست میں لیا اور	11فروری 88ء

قصور پنجاب	تشدد کیا	
148-یعقوب احمد ناصر	ملازمت سے برطرف	جون86ء
پاکستان آرمی کلرک		
149-احمدیہ کمیونٹی	زمین حکومت نے چھین لی	جون86ء
ڈی.جی خان پنجاب		
150-مبارک علی	زرعی فارم جلادیا گیا	جون86ء
سندھ		
151-احمدی درسگاہ	درسگاہ پر حکومت اور مولویوں نے	8جولائی86ء
ساہیوال' پنجاب	قبضہ کرلیا۔	
152-ریاض احمد	چھری سے قاتلانہ حملہ میں شدید	19جولائی86ء
اسلام آباد	زخمی	
153-30احمدی	گرفتار اور تشدد	
کراچی		
154-عبدالمجید	قرآنی آیات والی انگوٹھی پہننے	18جولائی86ء
مردان' صوبہ سرحد	پر گرفتار	
155-ارشاد احمد	مسجد میں مولویوں نے بند کردیا	29جولائی86ء
مردان' صوبہ سرحد	اور پھر گرفتاری	
156-واصف	گرفتار اور طویل حراست	21اگست86ء
گوجرانوالہ		
157-تین احمدی	کلمہ لکھنے کے جرم میں گرفتار	22اگست86ء
چک نمبر11' ضلع جھنگ		
158-عثمان احمد	عدالت کی طرف جاتے ہوئے حملہ	14اکتوبر86ء
ٹوبہ ٹیک سنگھ	شدید زخمی	

159-احمدیہ مدرسہ جھنگ	جلادیا گیا۔	16اکتوبر86ء
160-شیخ محمد امجد فیصل آباد	گرفتار و تشدد	24اکتوبر86ء
161-5احمدی فیصل آباد	مقدمہ کلمہ کیس	26اکتوبر86ء
162-نثار احمد بہاولنگر، پنجاب	سیکشن A-295اور 16M.P.O	19نومبر86ء
163-4احمدی مردان	بلاجواز مقدمہ	24نومبر86ء
164-شیخ کریم اللہ ایڈووکیٹ بہاولنگر پنجاب	M.P.O16	1دسمبر86ء
165-نثار احمد سیالکوٹ	مقدمہ A-295اور 295	10دسمبر86ء
166-احمدی لیڈی ٹیچر پتوکی	ہڑتال میں حصہ نہ لینے پر برطرف کردیا گیا۔	1جنوری1987ء
167-صدر جماعت احمدیہ مدینہ کالونی، لاہور	جھوٹے مقدمہ قتل میں الجھایا گیا	3جنوری87ء
168-ناصر احمد مردان	زبردست تشدد اور ایذارسانی	5جنوری87ء
169-احمدیہ مسجد مردان	گرادی گئی	7جنوری87ء
170-نذیر احمد مرحوم	لاش قبر سے نکلوانے پر غور	9جنوری87ء

بھلوال نگر پنجاب	کیا گیا۔	
171-مسز واحد بخش	لاش عام قبرستان میں نہ دفنانے	9جنوری 87ء
بستی یارو والی مظفر گڑھ	دی گئی	
172-ایک احمدی	پولیس نے گرفتار کرلیا	10جنوری 87ء
سرگودھا		
173-میر مبارک حسین	مذہبی تشدد کا شکار ہوا	25جنوری 87ء
سرگودھا		
174-مقدمہ	احمدیوں کے خلاف بے بنیاد مقدمہ	28جنوری 87ء
چنیوٹ پنجاب		
175-33احمدی	مختلف مقدمات میں الجھائے گئے	24جنوری 87ء
ٹوبہ ٹیک سنگھ		
176-کریم احمد	نامعلوم افراد کا حملہ اور تشدد	1فروری 87ء
جھنگ		
177-دو کانوں پر حملہ	پولیس کا حملہ	1فروری 87ء
جھنگ		
178-محمد امیر خان	گرفتار و تشدد	2فروری 87ء
179-مولوی خان محمد	298-C کے تحت گرفتار	8فروری 87ء
ڈی جی خان پنجاب		
180-احمدی املاک	پولیس کا حملہ	9فروری 87ء
جھنگ		
181-تین احمدی	کلمہ اور اذان کیس	10فروری 87ء
قصور پنجاب		
182-تین احمدی	298-C کے تحت گرفتار	11فروری 87ء

فیصل آباد		
183-ضمانت کا معاملہ	C-298 کے تحت گرفتار تین احمدیوں کی ضمانت مسترد ہوئی	15 فروری 87ء
جھنگ		
184-دو احمدی وکیل	مقدمات میں الجھائے گئے	15 فروری 87ء
جھنگ		
185-عبد الحق	C-298 اور A-249 کے تحت مقدمات	1 مارچ 87ء
سرگودھا		
186-مرزا مسیح احمد	ملازمت سے برطرف	2 مارچ 87ء
ساہیوال پنجاب		
187-محمود احمد شمس	مقدمہ میں الجھایا گیا	2 مارچ 87ء
ٹیکسلا		
188-محمود احمد چیمہ	C-298 کے تحت مقدمہ	5 مارچ 87ء
سرگودھا		
189-احمدیت	طلبا نے جلوس نکالا	7 مارچ 87ء
بہاولنگر		
190-ایک احمدی	تبلیغ کرنے کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔	10 مارچ 87ء
گوجرانوالہ		
191-قاضی منیر احمد	شوکاز نوٹس اور مشینری ضبط	12 مارچ 87ء
پرنٹر و پبلشر ربوہ		
192-عبد الجلیل	C-298 کے تحت گرفتار	15 مارچ 87ء
مردان		
193-عبد اللہ	زنا کے بے بنیاد مقدمے میں الجھایا گیا	16 مارچ 87ء
نواب شاہ		

194-پانچ احمدی سیالکوٹ	بے بنیاد مقدمہ	20مارچ87ء
195-پانچ قیدی سرگودھا	جیل میں گھر سے آنے والا کھانا نہ لینے دیا گیا۔	25مارچ87ء
196-دکانوں پر حملہ بہاولنگر پنجاب	طلبا کا حملہ، لوٹ مار	29مارچ87ء
197-مسجد پر حملہ خوشاب، پنجاب	ہجوم کا حملہ اور کلمہ مٹایا	31مارچ87ء
198-پانچ احمدی سیالکوٹ	بے بنیاد گرفتاری، دھمکی کا مقدمہ	2اپریل87ء
199-مقصود مبارک، حاکم جمیل خوشاب	298-C کے تحت گرفتار	13اپریل87ء
200-احمدی دوکاندار ربوہ	پولیس اور مولویوں کا مشترکہ حملہ	14اپریل87ء
201-کتاب کیس	دو احمدیوں پر کتاب پڑھنے کا مقدمہ بنایا گیا	14اپریل87ء
202-دو احمدی طلبا کوئٹہ بلوچستان	298-C کے تحت گرفتار	1جنوری86ء
203-مشرف بٹ نواب شاہ	شدید فائرنگ سے زخمی	4جنوری86ء
204-اسلم کھوکھر راولپنڈی	298-C کے تحت گرفتار	10جنوری86ء
206-چار احمدی نوجوان	298-C کے تحت گرفتار	

سیالکوٹ		
207-حکیم افضل فاروقی	16MPO کے تحت گرفتار	9 اکتوبر 1985ء
ضلع بہاولپور		
208-چار احمدی	295-A کے تحت گرفتار	
ڈی جی خان		
209-شیخ محمد	298-C کے تحت گرفتار	10 اکتوبر 85ء
فیصل آباد		
210-رفیع احمد	قاتلانہ حملہ	یکم ستمبر 85ء
کراچی		
211-ایک احمدی نوجوان	فائرنگ سے شدید زخمی	2 ستمبر 85ء
پنوں عاقل		
212-سات احمدی	بم دھماکہ کیس میں گرفتار	3 ستمبر 85ء
سکھر		
213-سیف اللہ	لاٹھیوں سے حملہ اور زخمی	5 ستمبر 85ء
رحیم یار خان		
214-احمدی مسجد	مولویوں کا حملہ اور توڑ پھوڑ	11 ستمبر 85ء
ساہیوال		
215-مقدمات	ایک سوچی سمجھی مہم کے تحت احمدیوں کے مقدمات میں گرفتار کروایا گیا۔	16 اکتوبر 85ء
ربوہ		
216-علی محمد	فائرنگ اور زخمی	20 اکتوبر 85ء
کراچی		
217-صدیق	قاتلانہ حملہ' زخمی	21 اکتوبر 85ء

کراچی		
218- مقصود	کلمہ بیج پہننے پر شدید تشدد	23 اکتوبر 85ء
نواب شاہ		
219- راشد احمد	کلمہ بیج پہننے پر شدید تشدد	23 اکتوبر 85ء
نواب شاہ		
220- محمد راشد بٹ	افطار پارٹی دینے پر مقدمہ	26 اکتوبر 85ء
شیخوپورہ	بنایا گیا	
221- احمدیہ مرکز	پولیس کا چھاپہ اور لٹریچر ضبط	28 اکتوبر 85ء
سرگودھا		
222- چودھری اطفال	قاتلانہ حملہ، شدید زخمی	29 اکتوبر 85ء
پنوں عاقل		
223- نصیر احمد، جاوید احمد	295-A، 295، 298-C	یکم اگست 85ء
مردان، سرحد		
224- عبد الرحمان خان	298-C	7 اگست 85ء
کوئٹہ، بلوچستان		
225- ڈی جی خان	عوام نے پولیس اور مولویوں کی "کلمہ مٹاؤ مہم" کو مسترد کر دیا	
226- مولانا غلام بشیر	گرفتاری، وجہ کوئی نہیں	22 اگست 85ء
سید عبد الحئی شاہ	298-C	
227- احمدیت کے خلاف مہم	جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں نے احمدیوں کے خلاف لٹریچر تقسیم کیا۔	25 اگست 85ء
228- احمدیوں پر مقدمے	کئی احمدیوں کے بے بنیاد	12 جولائی 85ء
گوجرانوالہ	مقدموں میں الجھایا گیا	

229-سات احمدی سکھر سندھ	بے بنیاد مقدموں میں الجھائے گئے	17 جولائی 85ء
230-لٹریچر مہم کوئٹہ بلوچستان	وسیع پیانے پر احمدیوں کے خلاف لٹریچر تقسیم کیا گیا	8 جولائی 85ء
231-دو احمدی کوٹری سندھ	ملازمتوں سے برطرف	10 جولائی 85ء
232-عامر حمید گوجرہ، فیصل آباد	295-C کے تحت گرفتار	16 ستمبر 1984ء
233-احمدی خاندان شیخوپورہ	معاشرتی بائیکاٹ	17 ستمبر 84ء
234-حافظ شکیل سرگودھا	معاشرتی بائیکاٹ	18 ستمبر 84ء
235-ایک احمدی نوجوان شاہ کوٹ، شیخوپورہ	آرمی میں لینے سے انکار کر دیا گیا۔	30 ستمبر 84ء
236-دو احمدی لڑکیاں قصور	اساتذہ نے اسلامیات پڑھانے سے انکار کر دیا۔	30 ستمبر 84ء
237-بشارت احمد ضلع سرگودھا	پاکستان ایئر فورس کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔	17 ستمبر 84ء

ضمیمہ 2

کلمہ کیس

متاثرہ اشخاص۔علاقہ وتھانہ	نوعیت کیس	تاریخ	سزااگر ہوئی
1۔احمدیہ کمیونٹی چنیوٹ وربوہ	کلمہ کیس+معاشرتی ہراسانی	11 اکتوبر سے 20 اکتوبر 1984ء تک	
2۔احمدیہ مرکز گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ	کلمہ کیس، گرفتاریاں	23 اکتوبر 84ء	
3۔احمدیہ مرکز ساہیوال، پنجاب	کلمہ کیس، بلاجواز گرفتاریاں	26 اکتوبر 84ء	
4۔پروفیسر محمد طفیل ساہیوال، پنجاب	کلمہ کیس، اذان کیس، گرفتاری	29 اکتوبر 84ء	
5۔ایس۔اے مجید فیصل آباد پنجاب	کلمہ کیس، پولیس نے جسمانی تشدد کیا۔	27 اکتوبر 84ء	
6۔احمدیہ سنٹر فیصل آباد، پنجاب	کلمہ کیس، دھمکیاں	29 اکتوبر 84ء	
7۔خواجہ مسعود احمد کریم نگر، پنجاب	کلمہ کیس، ہراساں	10 اکتوبر 84ء	
8۔مختار احمد	کلمہ کیس، پولیس تشدد	11 اکتوبر 84ء	

کریم نگر، پنجاب		
9-احمدیہ کمیونٹی	کلمہ کیس	17اگست1984ء
راولپنڈی		
10-احمدیہ مرکز	کلمہ مٹادیا گیا	8جولائی84ء
پنڈدادنخان، ضلع جہلم		
11-احمدیہ مرکز	ڈپٹی کمشنر نے کلمہ مٹانے کو کہا	22جولائی84ء
راولپنڈی		
12-احمدیہ مرکز	ڈی ایس پی نے احمدیہ مسجد سے	27مئی84ء
سمندری فیصل آباد	کلمہ مٹادیا۔	
13-احمدیہ مرکز	کلمہ زبردستی مٹادیا گیا	3جون84ء
نواب شاہ		
14-احمدیہ مرکز	کلمہ مٹادیا گیا	4جون84ء
سمندری، فیصل آباد		
15-احمدیہ مرکز(دارالذکر)	کلمہ مٹادیا گیا	7مئی84ء
علامہ اقبال روڈ، لاہور		
16-احمدیہ مرکز	کلمہ مٹادیا گیا	26مئی84ء
سمندری، فیصل آباد		
17-احمدی امیر	پولیس طلبی اور کلمہ مٹانے کے	19دسمبر
واہ کینٹ، ضلع راولپنڈی	لئے مذاکرات	
18-احمدیہ عبادت گاہ	کلمہ مٹادیا گیا	24نومبر1985ء
گوجرانوالہ، پنجاب		
19-احمدیہ عبادت گاہ	کلمہ مٹادیا گیا	20جنوری86ء
ڈسکہ، سیالکوٹ		

20-احمدیہ عبادت گاہ بہاولپور، پنجاب	پولیس نے کلمہ مٹادیا	15مئی 86ء
21-عبادت گاہ سرگودھا، پنجاب	پولیس نے کلمہ مٹادیا	11مئی 86ء
22-چودھری محمد اعظم	کلمہ بیج پہننے پر گرفتار کر لیا گیا	18مئی 86ء
23-عبادت گاہیں اور گھر مردان، صوبہ سرحد	پولیس نے جامہ تلاشی کے دوران کلمے مٹادیئے۔	15مئی 86ء
24-احمدیہ مسجد گجرات، پنجاب	ایضاً	10فروری 88ء
25-احمدیہ مسجد خوشاب، پنجاب	مسجد کو پولیس نے توڑا اور کلمہ مٹادیا۔	18فروری 88ء
26-احمدی گھر اور مسجد بہاولپور، پنجاب	کلمہ مٹادیا اور گھروں کو لوٹا	29مئی 86ء
27-حاجی ارشاد اللہ گوجرانوالہ، پنجاب	کلمہ بیج پہننے پر حراست میں لے لیا۔	4جون 86ء
28-عبادت گاہ ننکانہ صاحب، شیخوپورہ	اسسٹنٹ کمشنر اور پولیس نے کلمہ مٹادیا۔	29مئی 86ء
29-سربراہ احمدیہ کمیٹی جھنگ، پنجاب	پولیس اسٹیشن طلبی اور کلمہ مٹادیا گیا۔	18جون 86ء
30-احمدیہ عبادت گاہ سیالکوٹ	ایضاً	18جون 86ء
31-احمدیہ عبادت گاہ	ایضاً	19جولائی 86ء

ٹوبہ ٹیک سنگھ		
32-احمدیہ مسجد	مسجد پر پولیس اور عوام کا حملہ	31 اگست 86ء
ٹوبہ ٹیک سنگھ		
33-احمدیہ عبادت گاہ	مسجد پر پتھروں سے حملہ	5 اگست 86ء
سرگودھا، پنجاب		
34-احمدیہ مسجد	تحفظ ختم نبوت نے مسجد پر	6 اگست 86ء
گوجرانوالہ	قبضہ کرنے کی کوشش کی۔	
35-منور احمد	کلمہ پہننے پر گرفتار	9 اگست 86ء
کوئٹہ، بلوچستان		
36-90 احمدی	کلمہ بیج آویزاں کرنے پر گرفتار	7 اگست 86ء
مردان		
37-جہانگیر محمد جویا	کلمہ کیس، ایک سال قید	3 ستمبر 86ء
سرگودھا، پنجاب		
38-محمد یونس	کلمہ کیس، 10 سال قید بامشقت	10 ستمبر 86ء
پشاور، سرحد		
39-شیخ شبیر احمد	کلمہ کیس، 25 ہزار روپے جرمانہ	
شیخ جاوید احمد	10 سال قید بامشقت	
40-منیر احمد	کلمہ کیس + دو سال قید	28 ستمبر 86ء
کوئٹہ		
41-دو احمدی نوجوان	دو سال قید + کلمہ کیس	24 ستمبر 86ء
فیصل آباد		
42-تین احمدی نوجوان	کلمہ کیس	27 ستمبر 86ء
سرگودھا، پنجاب		

43-احمدی عبادتگاہ فیصل آباد	پولیس کا حملہ + کلمہ مٹا دیا	24 ستمبر 86ء
44-محمد ادریس پشاور	کلمہ کیس، 2 سال قید	26 ستمبر 86ء
45-احمدیہ عبادتگاہ جھنگ	کلمہ مٹا دیا، پولیس کا حملہ	8 اکتوبر 86ء
46-ڈاکٹر راشد احمد پشاور	کلمہ کیس + دو ماہ قید و تشدد	6 نومبر 86ء
47-طارق نسیم، محمد الیاس بھلوال، ضلع سرگودھا	کلمہ کیس + گرفتاری + کلمہ مٹا دیا	18 نومبر 86ء
48-احمدیہ مسجد چک نمبر 84 ضلع فیصل آباد	پولیس کا حملہ، گرفتاری، کلمہ مٹا دیا	22 نومبر 86ء
49-احمدیہ مسجد گجرات، پنجاب	پولیس کا حملہ، گرفتاری، کلمہ مٹا دیا	3 دسمبر 86ء
50-جہانگیر محمد جویا	کلمہ کیس، گرفتاری	8 دسمبر 86ء
51-جماعت احمدیہ مرکز ضلع راجن پور، پنجاب	پولیس کا حملہ، کلمہ مٹا دیا	15 دسمبر 86ء
52-بن احمد کوئٹہ، بلوچستان	کلمہ بیج، مقدمہ	3 جنوری 87ء
53-دوکان کیس جھنگ	احمدی کی دوکان سے کلمہ مٹا دیا گیا	
54-ملک مبارک احمد اٹک، پنجاب	شادی کارڈ پر اللہ کا نام لکھنے پر گرفتار کروایا گیا۔	22 جنوری 87ء

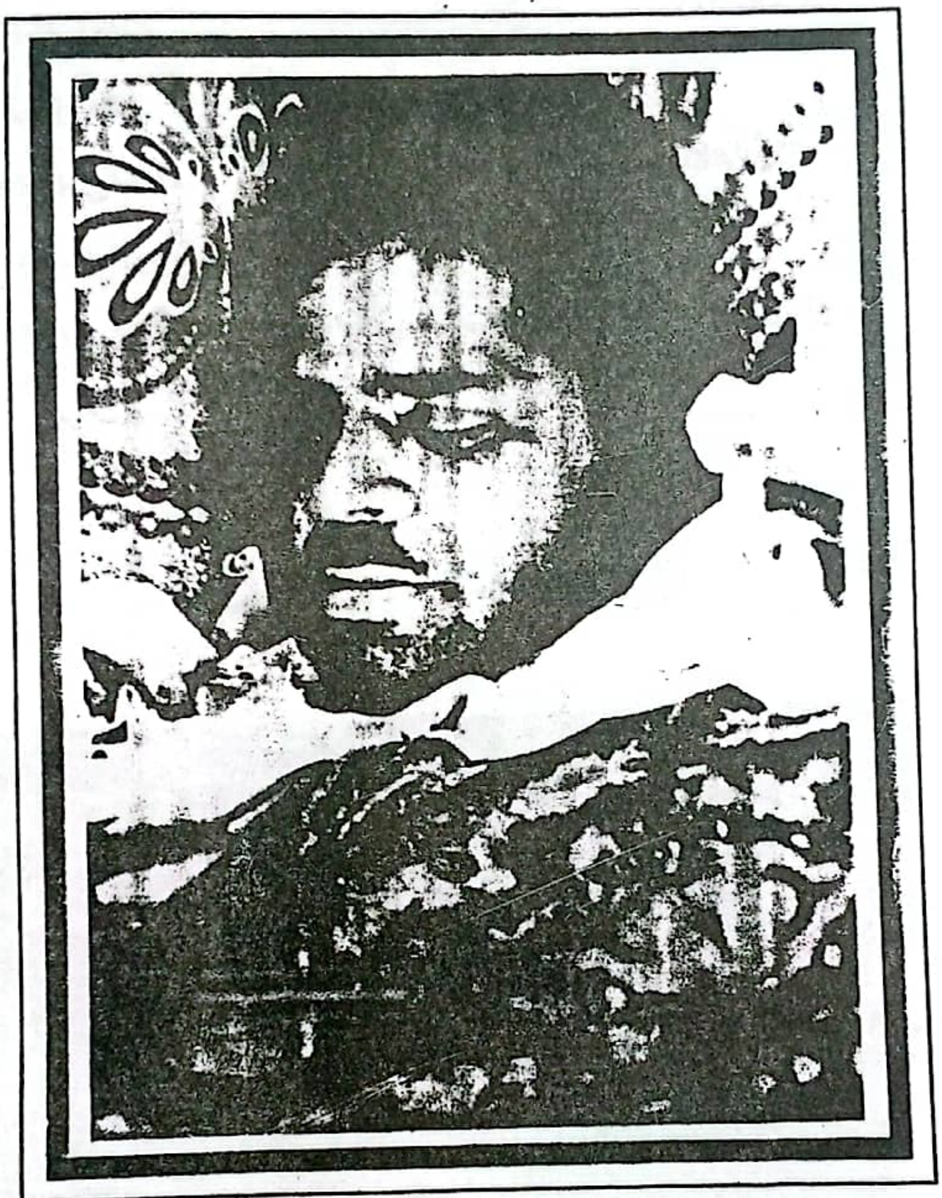
55-احمدیہ عبادت گاہ سرگودھا	کلمہ کیس + جلادیا	20اکتوبر86ء
56-امیر احمدیہ جماعت جہلم	پولیس نے طلب کیااور کلمہ مٹانے پر اصرار کیا۔	7فروری86ء
57-شیخ محمد یوسف قصور' پنجاب	ایضاً	11فروری86ء
58-احمدیہ مسجد سرگودھا	کلمہ مٹایا گیا	16فروری86ء
59-لاؤڈ سپیکر کا استعمال ربوہ	ڈپٹی کمشنر نے اجازت نہ دی	17فروری86ء
60-ملک زبیر احمد ملتان	کلمہ بیج پہننے پر گرفتار	24مارچ87ء
61-شیخ حفیظ ڈسکہ' سیالکوٹ	گھر سے کلمہ مٹادیا گیا	25مارچ87ء
62-کلمہ کیس لودھراں ڈسٹرکٹ	مقامی آبادی کے گھروں پر حملہ' پولیس نے کلمہ مٹادیا	9اپریل87ء
63-وحید احمد فیصل آباد	گرفتاری' کلمہ کیس	14اپریل87ء
64-احمدیہ عبادتگاہ گوجرانوالہ	کلمہ مٹادیا گیا	10اپریل87ء
65-احمدیہ عبادتگاہ راجن پور	ڈپٹی کمشنر نے کلمہ مٹانے کا حکم جاری کیا۔	11اپریل87ء
66-راشد احمد	کلمہ بیج پہننے پر شدید زخمی	31اگست85ء

رحیم یار خان	کیا گیا	
67-احمدی ملازم وہاڑی، ملتان	پولیس نے کلمہ والا بیج پہننے سے روک دیا۔	25 اگست 85ء
68-احمدی عبادتگاہ ڈی۔جی خان پنجاب	پولیس نے کلمہ مٹایا	16 جولائی 85ء
69-احمدیہ عبادتگاہ سکھر، سندھ	پولیس نے کلمہ مٹادیا	17 جولائی 85ء



"ہائے یہ بھی کرنا تھا مجھے"

قانون کا محافظ کلمہ طیبہ مٹاتے ہوئے، احمدیہ مسجد سرشمیر روڈ فیصل آباد



Mr. Ghulam Zaheer Sheikh

25th January 1987, Jehlum

ضمیمہ 3

قتل کیس

متاثرہ اشخاص۔علاقہ و تھانہ	نوعیت تشدد و کیس	تاریخ	سزا اگر ہوئی
1۔احمدی نوجوان شیخوپورہ' پنجاب	لاش دفنانے نہ دی گئی	2 اگست 1984ء	
2۔میاں غلام رسول دار النصر غربی' ربوہ	قتل کر دیا گیا	27 جولائی 84ء	
3۔حبیبہ ایبٹ آباد	دن دہاڑے انتہا پسندوں نے قتل کر دیا۔	31 جولائی 84ء	
4۔ڈاکٹر عبدالقدیر فیصل آباد	احمدی ہونے کی بنا پر بے رحمانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔	19 جون 84ء	
5۔احمدی خاتون کلہ' ضلع سیالکوٹ	لاش احمدی بیٹے کے حوالے نہ کی گئی۔	20 جون 84ء	
6۔عبدالرحمان قریشی سکھر' سندھ	قتل کر دیا گیا	1 مئی 84ء	
7۔سید قمر الحق سکھر' سندھ	بے رحمانہ قتل	11 مئی 86ء	
8۔خالد سلیمان	بے رحمانہ قتل	9 جون 86ء	

سکھر، سندھ

9- رخسانہ | بے رحمی سے قتل کردی گئی | 4 اپریل 86ء

مردان، صوبہ سرحد

10- چودھری عبدالحمید | بے رحمی سے قتل کردیا گیا

مہراب پور، نواب شاہ

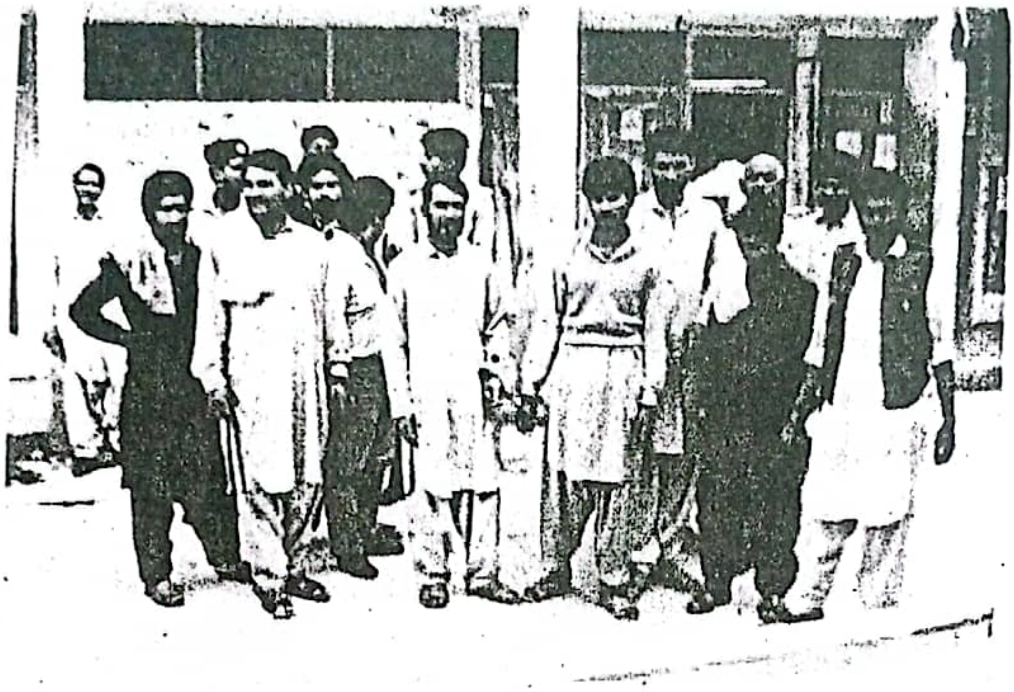
11- جمشید احمد | دن دہاڑے قتل | 9 اکتوبر 86ء

کانڈیوال، سرگودھا



MR GHULAM ZAHEER SHEIKH

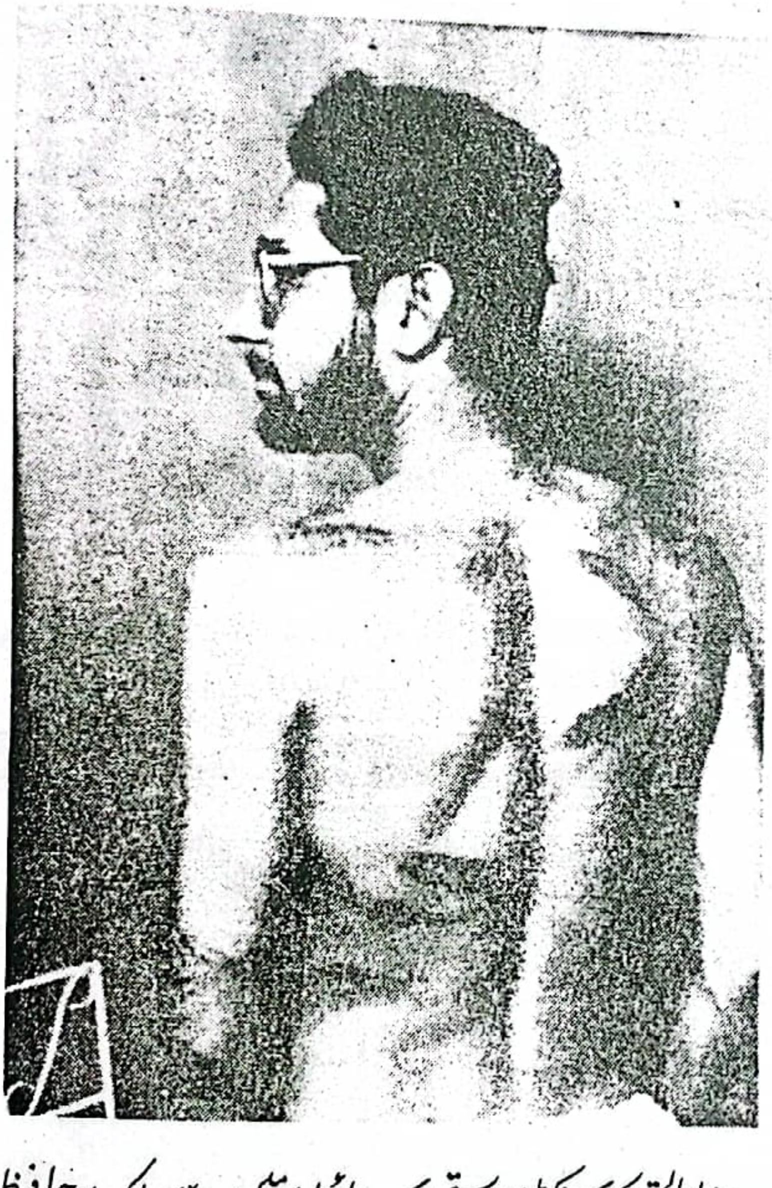
Murdered on 25th February 1987
Place: Sohawa District Jhelum, Punjab



Members of Jama'at Ahmadiyya Islamabad under trial in Kalima and other cases



”جرم تو بتایا ہوتا میرا“



دورِ ضیاء الحق کے سینکڑوں ستم رسیداؤں میں سے ایک حافظ
محمدؐ امجد عارف (سرگودھا ربوہ) بھیانک تشدد کی ایک جھلک

ضمیمہ 4

احمدی اور ریاستی دہشت گردی

1991ء کا جائزہ

احمدی اخبارات کے خلاف کارروائی

تعزیرات پاکستان کی دفعات A-295 اور C-298 کے تحت درج شدہ ایک مقدمے میں ہفتہ وار "لاہور" کے ایڈیٹر اور پبلشر، ثاقب زیروی اور اس کے پرنٹر، محمد شفیع کو رہا کر دیا گیا۔ عدالت کے پریذائڈنگ آفیسر کے مطابق ان کے خلاف الزامات کو ثابت نہیں کیا جاسکا۔ مدعا علیہان پر الزام تھا کہ ستر سال پہلے شائع ہونے والے مولانا محمد علی جوہر کے ایک مضمون کو چھاپ کر انہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

1991ء کے دوران احمدی مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف مبینہ طور پر غیر قانونی مواد شائع کرنے کے سلسلے میں کئی مقدمات درج کئے گئے۔ ان مقدمات کے متعلق ضروری کوائف درج ذیل ہیں:

ملزم کا نام / جگہ	تھانہ	تعزیرات پاکستان کی دفعہ	کارروائی کا سبب
1-منور احمد قریشی (راولپنڈی)	وارث خان	298-C	کیلنڈر پر کلمہ طیبہ تح...

2-سید عبدالحئ اور عبدالمجید	ربوہ	298-B	آسٹریلیا میں مرزا طاہر احمد کی تقریر پر مشتمل ایک پمفلٹ تقسیم کیا
3-خان محمد اور رفیق نسیم	ڈیرہ غازی خاں	295-A	قرآن شریف کا سرائیکی ترجمہ شائع کیا
4-محمد رفیع ناصر	ربوہ	298-C	1991ء کے کیلنڈر میں مرزا غلام احمد کا ذکر مسیح کے طور پر کیا۔
5-مرزا خورشید احمد، نسیم سیفی آغا سیف اللہ قاضی منیر احمد	عدالت مجسٹریٹ ٹنڈو آدم (سندھ) میں نجی شکایت نمبر 445/91	298-C	روزنامہ ''الفضل'' میں ایک خبر شائع کرنے کے سلسلے میں
6-نسیم سیفی، آغا سیف اللہ، قاضی منیر احمد، ربوہ	ٹنڈو آدم کی عدالت میں نجی شکایت نمبر 446/91	298-C	
7-نسیم سیفی، آغا سیف اللہ، قاضی منیر احمد، ربوہ	ٹنڈو آدم کی عدالت میں نجی شکایت نمبر 447/91	298-C	
8-نسیم سیفی، آغا سیف اللہ، قاضی منیر احمد، ربوہ	ٹنڈو آدم کی عدالت میں نجی شکایت نمبر 448/91	298-C	
9-نسیم سیفی، آغا سیف اللہ، قاضی منیر احمد، ربوہ	ٹنڈو آدم کی عدالت میں نجی شکایت نمبر 449/91	298-C	

31 دسمبر 1991ء تک احمدی مسلک سے تعلق رکھنے والے 41 افراد کے خلاف، 1985ء سے لے کر 1990ء کے دوران درج شدہ 45 مقدمات کی سماعت ربوہ کی عدالتوں میں جاری تھی۔ جن مطبوعات کے خلاف کارروائی ہوئی ان میں روزنامہ الفضل (12 مقدمات) ماہنامہ انصار اللہ (8 مقدمات)، ماہنامہ خالد (7 مقدمات)، ماہنامہ مصباح (5 مقدمات)، ماہنامہ تحریک جدید (5 مقدمات)، ماہنامہ تشحیذ (4 مقدمات) اور مختلف پمفلٹ (8 مقدمات) شامل ہیں۔ 41 ملزمان میں سے قاضی منیر احمد کی 35 مقدمات، مسٹر نور محمد نسیم سیفی کی 17، مسٹر مبارک احمد خالد کی 9، چوہدری محمد ابراہیم، مرزا احمد دین ناز اور مسعود احمد دہلوی کی 7، مسٹر عبداللطیف خان اور آغا سیف اللہ کی 5، سید عبدالحئ،

مرزا طاہر احمد، مسٹر اسمٰعیل منیر ثانی اور مسٹر قمر داؤد کھوکھر کی 4، ملک خالد مسعود کی 3، حافظ مظفر احمد اور مسٹر یوسف اسمٰعیل کی 2 اور 26 افراد کی ایک ایک مقدمے میں جواب طلبی مقصود تھی۔

آزادی اظہار کو کچلنے کے لئے قانون کا استعمال احمدیوں تک ہی محدود نہیں تھا۔ اس کا ایک معروف شکار اختر حمید خان تھے جو بین الاقوامی سطح پر معروف اورنگی پائیلٹ پروجیکٹ کے بانی ہیں۔ ان کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے تحت اس بنا پر مقدمہ درج کیا گیا کہ بچوں کے لئے لکھی جانے والی ایک نظم میں وہ رسول پاک کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

احمدیوں کے اجتماع پر پابندی

ملک بھر میں ضلعی حکام اکثر ضابطہ فوجداری کی دفعہ 144 کے تحت چار یا چار سے زیادہ اشخاص کے ایک جگہ اکٹھا ہونے پر پابندی عائد کرتے رہے تاکہ امن عامہ میں کوئی خلل نہ پڑے۔ لیکن عمومی طور پر عوامی اجتماع منعقد کرنے یا جلوس نکالنے کے حق کا احترام ہی کیا جاتا رہا۔ ماسوائے احمدیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد کے، جن کے حق اجتماع کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

احمدیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد، ہر سال اجتماعات اور کھیلوں کے مقابلے منعقد کرتے ہیں۔ ماضی میں ان اجتماعات میں لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت تقریباً ہمیشہ ہی دی جاتی رہی ہے۔ لیکن 1984ء سے یہ روایت ختم کر دی گئی۔ 1991ء کے دوران مندرجہ ذیل واقعات کی اطلاعات موصول ہوئیں:-

احمدیہ مسلک سے تعلق رکھنے والی خواتین کی تنظیم "لجنہ اماءاللہ" ربوہ نے چار دیواری کے اندر عورتوں کے کھیلوں کا ایک ٹورنامنٹ منعقد کرنے کے لئے لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت طلب کی۔ اسسٹنٹ کمشنر نے لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت دے دی، بشرطیکہ کھیلوں میں حصہ لینے والی خواتین کا تعلق صرف ربوہ سے ہو اور کھیلوں کے علاوہ کوئی دوسری سرگرمی واقع نہ ہو۔ ظاہر ہے یہ حکم لاؤڈ سپیکر کے استعمال کی اجازت نہ دینے کے مترادف تھا کیونکہ اس ٹورنامنٹ میں ملک بھر کی کھلاڑی خواتین حصہ لے رہی تھیں۔

18 اکتوبر سے 20 اکتوبر تک، خواتین کی اسی تنظیم نے اپنے دفتر کی چار دیواری میں سالانہ جلسہ

منعقد کرنا تھا۔ 17 اکتوبر کو ضلع مجسٹریٹ نے مندرجہ ذیل شرائط پر لاؤڈ سپیکر کے استعمال کی اجازت دے دی۔

1- بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کئی فرقہ وارانہ / سیاسی / مذہبی یا نزاعی مسئلہ پر کوئی بحث نہیں ہو گی۔

2- میگافون کے امپلی فائر کا رخ سامعین کی طرف ہو گا اور آواز کا حجم معقول حد تک دھیما رکھا جائے گا۔

3- میگافون کا استعمال لجنہ اماءاللہ ربوہ کی چار دیواری / احاطہ میں ہو گا۔

4- اذان یا نماز کے وقت لاؤڈ سپیکر استعمال نہیں کیا جائے گا۔

5- میگافون پبلسٹی مقاصد / اعلانات کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔

اگلے ہی روز ضلع مجسٹریٹ نے اجازت نامہ واپس لے لیا کیونکہ ضلعی انتظامیہ کو اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ جلسے کے منتظمین نے متذکرہ بالا شرائط کی خلاف ورزی کی ہے اور یہ کہ "اجازت نامے کا جاری رہنا امن عامہ کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔"

انہی دنوں جب خواتین کا اجتماع تھا (18 سے 20 اکتوبر) مجلس خدام الاحمدیہ کا سالانہ اجتماع بھی منعقد ہونا تھا۔ 19 ستمبر کو میگافون استعمال کرنے کی اجازت طلب کی گئی۔ 17 اکتوبر کو ضلع مجسٹریٹ نے اپنی شرائط کے تحت، جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ ایک بار پھر، اگلے ہی روز یہ اجازت واپس لے لی گئی۔ ضلعی انتظامیہ نے اس سلسلے میں انہی وجوہات کو بہانہ بنایا جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

○ مجلس انصار اللہ کے انعقاد کے سلسلے میں بھی سرکاری احکامات کا ایک ایسا ہی سلسلہ مشاہدہ میں آیا۔ (اکتوبر 25 تا 27)

○ آخر میں نومبر کے مہینے میں احمدیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد نے ربوہ میں منعقد ہونے والے سالانہ اجتماع کے لئے اجازت طلب کی۔ 11 جنوری 1992ء کو ضلعی انتظامیہ نے مندرجہ ذیل ریمارکس کے ساتھ اجازت دینے سے انکار کر دیا:-

"بحوالہ متذکرہ بالا عنوان پر آپ کی چٹھی مورخہ 21-11-1991 ہمیں افسوس ہے کہ جماعت

احمدیہ کو ربوہ میں سالانہ جلسہ منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

صد سالہ تقریبات پر پابندی' ہائی کورٹ کا فیصلہ

ستمبر 1991ء میں لاہور ہائی کورٹ نے اس درخواست پر اپنا فیصلہ صادر کیا' جو احمدیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے نمائندہ افراد نے دائر کی تھی۔ اس درخواست میں صوبائی سیکرٹری داخلہ کے 20 مارچ 1984ء کے اس حکم کو چیلنج کیا گیا تھا جس کے تحت صوبہ پنجاب میں احمدیوں کی صد سالہ تقریبات پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ درخواست میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جھنگ کے مورخہ 21 مارچ 1989ء اور ریذیڈنٹ مجسٹریٹ کے ان احکام کو چیلنج کیا گیا تھا جن کے تحت احمدیوں کے اجتماع پر پابندی لگادی گئی تھی اور احمدیہ مسلک کے عہدیداروں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ شہر سے تقریبات کے سلسلے میں تعمیر کی گئی آرائشی محرابوں کو ہٹادیں۔ درخواست گزاروں نے عدالت عالیہ سے حکومت کو یہ ہدایت جاری کرنے کی بھی گذارش کی کہ انہیں ان حقوق کی بجاآوری سے نہ روکا جائے جن کا آئین کے آرٹیکل نمبر 20 میں ذکر ہے۔

اپنے 62 صفحاتی فیصلے میں عدالت عالیہ نے درخواست کو بغیر کسی استحقاق کے گردانتے ہوئے رد کردیا اور اس رائے کا اظہار فرمایا "سرکاری پالیسی" مفاد عامہ اور ملک کے ایک عام آدمی کے مفادات سے متعلق دلائل' تقریبات پر پابندی عائد کرنے کی معقول بنیاد فراہم کرتے ہیں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ریذیڈنٹ مجسٹریٹ کی ہدایات بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ اس بات کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے' کہ ایمان کے چشمہ (مین سٹریم) کو پاک اور صاف اور امت کی یک جہتی کو برقرار رکھنے کی خاطر' مسلم امہ احمدیوں کی سرگرمیوں اور ان کے عقیدے کے پرچار کی مزاحمت کرتی ہے۔ ایسا کرنے سے قادیانیوں کے عقیدے کی آزادی کے حق کی بجاآوری پر کسی قسم کی کوئی زد نہیں پڑتی۔"

"کافر" بمقابلہ اسلام

انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے سب سے زیادہ تشویش میں مبتلا' احمدیہ اقلیت تھی۔ ان کے اپنے

خیال میں وہ ایک اقلیت نہیں بلکہ مسلم معاشرے کا ایک حصہ ہیں۔ یہی بات ان کے تمام مصائب کا باعث بنی۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ رسول پاک ﷺ کو اللہ کا آخری نبی نہیں سمجھتے تھے (احمدیوں کے نزدیک یہ الزام غلط تھا) چنانچہ 'انہیں محض یہ کہ غیر مسلم بلکہ اس سے بد تر تصور کیا جاتا ہے۔ جیسے اسلام کے مقابلے میں کفر اور الحاد۔ اس کی وجہ سے' دوسری اقلیتوں کی نسبت' ان کے خلاف زیادہ امتیازی سلوک روا رکھا جانے لگا۔ انہیں قرآنی آیات کی تلاوت کرنے' اذان دینے یا اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنے سے قانوناً منع کر دیا گیا۔ بسم اللہ اور ماشااللہ جیسے روزمرہ استعمال کی عربی اصطلاحات اور الفاظ کو زبان پر لانے پر انہیں سزا دی گئی۔ دوسری اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد اگر یہ الفاظ منہ سے نکالیں تو اتنا سخت اعتراض کرنے کی بجائے تھوڑی بہت خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ احمدیوں کو کسی ایسی چیز کی اجازت نہیں ہونی چاہئے جس سے یہ شائبہ تک ہو کہ ان کا اسلامی عقائد سے دور کا بھی کوئی تعلق یا واسطہ ہے۔

1991ء کے دوران رنگ' نسل یا مذہب کی بنیاد پر اقلیتوں خاص طور پر احمدیوں کے خلاف رویہ اور چیدہ چیدہ واقعات کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

○۔ مارچ کے آغاز میں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ مرکزی حکومت نے ان تمام ملازمین کے کوائف طلب کئے ہیں' جن کا تعلق احمدیہ مسلک سے ہے۔ یہ اطلاع بھی ملی کہ کابینہ کے فیصلے کے مطابق کسی احمدی کو مسلح افواج' جاسوسی کرنے والے ادارے اور دفتر خارجہ کے علاوہ دوسرے اداروں میں بھی اہم یا کلیدی عہدوں پر فائز ہونے کی اجازت نہیں ہو گی۔ کمیشن (HRCP) کے نوٹس میں ایسی مثالیں لائی گئیں جہاں میرٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے' درمیانے درجے کے عہدوں پر بھی بھرتی اور ترقی کے معاملات میں امتیاز برتا گیا۔

○۔ لاہور میں سٹیٹ بینک کے 8 احمدی ملازمین کو کنٹین کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے سے منع کر دیا گیا۔ اس سے قبل امتیازی سلوک صرف ان ملازمین کے استعمال میں آنے والے برتنوں کو علیحدہ رکھنے تک محدود تھا۔

○۔ 2 اگست 91ء کو بادامی باغ لاہور کے رہائشی بزرگ احمدی میر تاج دین کی اہلیہ غلام فاطمہ کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے والے محلے کے غیر احمدی مسلمانوں کے بارے میں مقامی مسجد کے ملاء

نے فتویٰ دیا کہ احمدی خاتون کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے سے ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں لہٰذا انہیں دوبارہ نکاح پڑھوانے چاہئیں نیز احمدی خاتون کو مقامی قبرستان میں دفنانے سے روکنے کی کوششیں کی گئیں۔

عبادت کرنے پر سزا

- ملتان الیکٹرک سٹی سپلائی کارپوریشن کے ایک احمدی انجینئر محمود الشمس کو دفتر کے میدان میں مسلمانوں کے انداز میں نماز ظہر ادا کرنے پر مقامی مجسٹریٹ نے ایک سال قید بامشقت اور 1000 روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی۔ سیشن کورٹ نے اس سزا کو بحال رکھا لیکن بعد ازاں ہائی کورٹ نے اسے ضمانت پر رہا کر دیا۔
- احمدیوں کے صد سالہ جشن پر 1989ء میں جو پابندی عائد کی گئی' ہائی کورٹ نے اسے برقرار رکھا۔ اس سے قبل ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کی طرف سے یہ دلائل پیش کئے کہ قادیانیوں کو جشن منعقد کرنے کی اجازت کا مطلب ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی آزادی دینے کے مترادف ہو گا جو آئین کے آرٹیکل 295 کے تحت ایک جرم ہے جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ سرکاری وکیل نے کہا کہ اگر کوئی احمدی اپنے بچے کو اپنے مذہب کی تعلیم دیتا ہے تو یہ بھی پاکستان کے آئین کے تحت ایک جرم ہے۔ 1985ء میں شریعت کورٹ نے بھی یہ فیصلہ سنایا تھا کہ احمدیوں کو ان کے مسلک کی تبلیغ سے باز رکھنا' آئین کے تحت دیئے گئے انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہے۔
- پنجاب حکومت نے احمدیوں کے سالانہ کنونشن منعقد کرنے کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا۔ 8000 کے لگ بھگ احمدی اس وقت تک کنونشن کے مقام "ربوہ" پہنچ چکے تھے۔ انجمن ختم نبوت' احمدیوں کی مخالفت میں پیش پیش ایک تنظیم' کچھ عرصہ قبل ہی یہاں ایک اجلاس منعقد کر چکی تھی جس میں اس نے اجازت نامہ واپس لینے کا مطالبہ کیا تھا۔

1992ء کا جائزہ

اس سال کے دوران 150 سے زائد مقدمات احمدی کمیونٹی کے افراد اور مطبوعات کے خلاف درج کرائے گئے--- مقدمات کی وجہ اس بار بھی قرآنی آیات' اسلامی شعار اور بسم اللہ کا لکھنا قرار پایا--- ان سب مقدمات کے فیصلے کے تحت احمدی مسلمانوں کو دو ماہ سے دو سال تک کی قید سنائی گئی۔ حاصل کردہ تفصیلات کے مطابق:

1- 11 سے زائد احمدی عبادت گاہوں کو شہید کر دیا گیا یا مسمار کر دیا گیا۔

2- 11 سے زائد احمدی عبادت گاہوں کو تعمیر ہونے سے روک دیا گیا۔

3- 22 احمدیوں کو دردناک طریقے سے قتل کر دیا گیا۔

4- 22 احمدیوں کو شدید جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

5- 12 سے زائد قبروں کی بے حرمتی کی گئی۔

6- 19 میتوں کو دفنانے نہ دیا گیا۔

7- 112 احمدی افراد کو مختلف ناجائز مقدمات میں گرفتار کیا گیا۔

8- 718 افراد پر کلمہ طیبہ کا "Badge" آویزاں کرنے پر گرفتار کیا گیا۔

9- 729 افراد پر اذان پڑھنے کے الفاظ میں مقدمات بنائے گئے۔

10- 91 افراد پر نماز ادا کرنے کے جرم میں مقدمات بنائے گئے۔

11- 10 افراد کے خلاف قرآن پاک کی "تلاوت" کے "الزام" میں مقدمات بنائے گئے۔

12- مختلف احمدی جرائد کے مدیران کے خلاف 38 مقدمات بنائے گئے۔

13- 460 سے زائد احمدی مطبوعات کو ضبط کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ مصنفین اور پبلشرز کے خلاف مقدمات بنائے گئے۔

14- 31 احمدی جو حکومت کے ملازم تھے' کو ملازمتوں سے بلاجواز برطرف کر دیا گیا۔

15- 245 کینال کی زمین جو ربوہ میں احمدیوں کی ملکیت تھی' کو حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔

16- ڈیرہ غازی خان کے خان محمد اور رفیق احمد نعیم کو (A, B, C) 295 کے تحت گرفتار کیا گیا۔ ان دونوں افراد نے قرآن پاک کو سرائیکی زبان میں Translate کیا تھا۔

17- گذشتہ کی طرح اس سال بھی احمدیوں کو ربوہ میں سالانہ اجتماع منعقد کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔

18- انتہا پسند ملا پارٹیوں' نے اپنے اس غیر انسانی دباؤ کو جاری رکھا کہ گورنمنٹ کے تمام احمدی ملازمین کو برطرف کیا جائے اور یہ کہ پاکستان کو ایک ''سنی ریاست'' قرار دیا جائے۔

19- پنجاب کے جاہل وزیر اعلیٰ نے اپنے اس بیان سے کہ احمدیوں نے وسطی ایشیا کی ایک مسلم ریاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے' کے ذریعے احمدیوں کے خلاف عام آدمی کے جذبات بھڑکانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور یوں پاکستان کی اس ''اچھوت نسل'' کے خلاف حکومتی ایوانوں' گلیوں' محلوں اور چوک چوراہوں میں غلیظ گالیوں' حملوں اور تشدد کا سلسلہ پھوٹ پڑا۔

1993ء کا جائزہ

1993ء کا سال بھی پاکستانی اقلیتوں کے لئے مصائب و آلام کا سال ثابت ہوا۔ ان میں سب سے زیادہ متاثرہ افراد کا تعلق احمدی کمیونٹی سے تھا۔

پاکستان کی عدالت عظمیٰ نے سال نو کے آغاز میں ایک پٹیشن کی سماعت شروع کی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ آرڈیننس XX 1984ء کے تحت احمدیوں کو مذہبی سرگرمیوں اور اعمال سے جو روکا گیا ہے اس پر نظرثانی کی جائے۔ سپریم کورٹ نے پانچ ماہ کے بعد اپنے اکثریتی فیصلے میں کہا کہ الفاظ' اشعار' محاورات اور آیات جو ایک مذہبی گروہ کے لئے مختص ہیں' کو دوسرا گروہ اگر استعمال کرے گا تو وہ نقل' مذہب پر حملہ اور ملاوٹ کے مترادف ہے لہٰذا نظرثانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ کہ احمدیوں کو اپنے لئے الگ Terminology استعمال کرنا ہوگی۔

عدالت نے مزید احمدیوں پر لگائی گئی ان پابندیوں کو جائز قرار دیا جن کے تحت احمدی اپنی عبادتگاہ کو ''مسجد'' نہیں کہہ سکتے--- نماز کے بلاوے کے لئے ''اذان'' نہیں دے سکتے--- شادی کے

موقع پر "نکاح مسنونہ" ادا نہیں کر سکتے--- ملاقاتی آداب کے تحت "السلام علیکم" کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے-- اس کے الفاظ "اچھوت نسل" کو انشاء اللہ، ماشاء اللہ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے، لکھنے یا زبان سے ادا نہ کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے اور اس طرح وہ غیر تہذیبی، جاہلانہ اور غیر انسانی پابندیوں جو احمدیوں پر ماضی میں مسلط کی گئی تھیں، کو ہر بار پاکستان کی عدالت عظمیٰ نے بھی نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ اسے ایک اہم ضرورت گردانا۔

1993ء کے چند ایک اہم واقعات درج ذیل ہیں:

1- راولپنڈی کے منور احمد قریشی کو کلمہ طیبہ، انشاء اللہ اور السلام علیکم ایک کیلنڈر پر لکھنے کے الزام میں 3 سال قید بامشقت سنائی گئی اور اس کے علاوہ 15000 روپے جرمانہ بھی ڈالا گیا۔

2- ڈیرہ اسماعیل خان کے راشد احمد سنوری کو سیکشن 298-C کے تحت گرفتار کیا گیا اور ضمانت منظور نہ کی گئی۔

3- پھاگلہ کے سید بشیر احمد کو ایک احمدی لیڈر کی "Biography" تقسیم کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ جب بشیر احمد کو ضمانت پر رہا کیا گیا تو عدالت کے باہر ہزاروں افراد نے جلوس نکالا جس نے بعد ازاں 5 احمدیوں کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا اور مارا پیٹا۔

4- احمدی جرائد، الفضل، مصباح، انصار اللہ کے خلاف 298-C کے تحت مقدمات بنائے گئے۔

اس سال بھی معاشرتی نفرت کا وہ سلسلہ جو کئی سالوں سے تحریک ختم نبوت کے پلیٹ فارم سے جاری ہوا تھا، جاری رہا۔ اس سال میں بھی احمدیوں کے خلاف جلسے جلوس، گالم گلوچ، مقدمہ بازی، نفرت، تشدد، معاشرتی ہراسانی اور غیر انسانی برتاؤ اپنے پورے زور و شور کے ساتھ جاری رہا۔ چند واقعات جن کی تفصیلات حاصل کی گئیں درج ذیل ہیں۔

1- ہارون آباد احمدی کمیونٹی کے سربراہ ریاض قمر کو مئی میں آدھی رات کے وقت اس وقت بد ترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا جب وہ گھر میں سو رہے تھے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے بعض لوگوں کو گھر پر بلایا ہے تاکہ وہ "Satellite" پر احمدی سربراہ کا جمعہ کا خطبہ سن سکیں۔

2- یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور اور علامہ اقبال میڈیکل کالج میں 1993ء کے

آخر میں دو طلبا تنظیموں نے احتجاج کا ایک زبردست سلسلہ شروع کیا جس کے مطابق تمام احمدی طلبا کو تعلیمی اداروں سے خارج کیا جائے' آئندہ داخلہ نہ دیا جائے۔ اس طرح یونیورسٹی کے دو احمدی طلبا اور میڈیکل کالج کی ایک احمدی طالبہ کو سرعام مارا پیٹا گیا۔

3- 90 سالہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک احمدی کی لاش مقامی قبرستان میں نہ دفنانے دی گئی اور یہ سارا عمل پولیس کی مدد سے ہوا۔

4- فیصل آباد میں تمام سکولوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ احمدی طلبا کو قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم نہ سیکھنے دیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن نے اپنے داخلہ فارم میں مزید یہ جمع کیا کہ داخلے کے متمنی طلبا کو اس بات کو یقینی بنانا ہو گا کہ وہ احمدی فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے اور مزید احمدی طلبا کو یہ حلف نامہ دینا ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔

5- سرگودھا میں دار ارقام سے ایک احمدی لڑکی کو خارج کر دیا گیا تا کہ وہ قرآن پاک کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

1994ء کا جائزہ

مطبوعات اور صحافیوں پر دباؤ

سال کے دوران احمدی مطبوعات اور صحافیوں پر دباؤ بڑھ گیا۔ سال کے اوائل میں پانچ صحافی نور محمد سیفی ایڈیٹر روزنامہ "الفضل" آغا سیف اللہ' قاضی منیر احمد اور ماہنامہ "انصار اللہ" کے ایڈیٹر مرزا محمد دین ناز اور محمد ابراہیم کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298-C کے تحت حراست میں لے لیا گیا (خود کو مسلمان ظاہر کرنے اور احمدیت کا پرچار کرنے جیسے الزامات کے تحت) سیشن جج چنیوٹ نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا اور ان الزامات میں توہین رسالت (دفعہ 295-C) کے الزام کا اضافہ کر دیا' جس کی سزا موت ہے۔ انہیں ایک ماہ کے بعد ضمانت پر رہا کر دیا گیا لیکن ان کے خلاف عائد کردہ الزامات اور سزائے موت کا امکان التواء میں پڑا رہا۔

امتیازی سلوک / ہراساں کرنے کے دوسرے واقعات

1994ء کے دوران' احمدیوں کے خلاف قانونی کارروائیوں' مذہبی پروپیگنڈہ اور سماجی دباؤ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں منظر عام پر آنے والے چند واقعات درج ذیل ہیں:

عبادت گاہ کا گرایا جانا: مرکزی احمدیہ تنظیم کی ملکیت میں راولپنڈی میں ایک قطعہ اراضی تھا جسے وہ گذشتہ بیس برسوں سے جمعہ اور عید کی نماز ادا کرنے کے لئے ایک مناسب ہال میں بدل دیا جائے۔ راولپنڈی ترقیاتی ادارے کو اس سلسلے میں بلڈنگ پلان پیش کیا گیا۔ قدامت پسند حلقوں نے کام کے شروع ہوتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انتظامیہ نے ان حلقوں کی دلجوئی کی خاطر دو احمدیوں کو دفعہ 298-C کے تحت حراست میں لے لیا۔ ان میں تنظیم کے راولپنڈی برانچ کے سربراہ بھی شامل تھے' تنظیم نے اس ڈھانچے کے گرائے جانے کے خلاف ایک حکم امتناعی بھی حاصل کر لیا لیکن سول جج نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ یہ فیصلہ جمعرات کے روز صادر کیا گیا جس کا مقصد ظاہری طور پر تو یہی نظر آتا تھا کہ اس حکم امتناعی کے خلاف اپیل کرنے کے فوری عمل کی پیش بندی کی جا سکے۔ راولپنڈی ترقیاتی ادارے نے 15 ستمبر کو اسی روز بعد از دوپہر پولیس کی نفری اور ایک مجسٹریٹ کی زیر نگرانی عبادت کی جگہ کو گرانا شروع کر دیا۔

مبلغین کو سزائیں: ایک قبائلی جرگہ نے کوئٹہ کے تین افراد مبارک احمد ناصر' احسان اللہ چیمہ اور آصف جاوید کے خلاف اس جرم کے تحت مقدمہ کی سماعت کی کہ انہوں نے اپنے سینوں پر کلمہ طیبہ کے بیج لگا رکھے تھے۔ جرگہ نے سفارش پیش کی کہ انہیں اس جرم کی سزا دی جائے۔ 21 ستمبر کو اسسٹنٹ کمشنر نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298-C کے تحت انہیں ایک سال قید اور 5,000 جرمانہ کی سزا دی۔

دو ہلاک' دو زخمی: 30 اگست کو فیصل آباد میں مسلح افراد نے گولی مار کر دو افراد عبدالحفیظ عمر 18 سال اور وسیم احمد عمر 24 سال کو ہلاک اور دو افراد محمد امین عمر 27 برس اور اختر عمر 17 برس کو زخمی کر دیا۔ امین کو پیٹ اور اختر کو ٹانگوں پر زخم آئے۔ یہ چاروں افراد احمدی تھے اور ہمسایوں کی ملی بھگت سے عمل میں آیا۔ مجرمان کا پتہ نہ چل سکا۔ کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

راجن پور میں خوف و ہراس: راجن پور میں چند افراد نے احمدی مسلک اختیار کر لیا جس کے رد عمل کے طور پر داجل میں مقیم احمدی مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہراساں کرنا' راجن پور

کے احمدیہ چیف کے گھر کا محاصرہ کرنا اور اس کے خلاف توہین رسالت کے جرم میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے تحت مقدمہ درج کرنے کے لئے ڈپٹی کمشنر پر دباؤ ڈالنا شامل تھا۔ مہم کے نتیجہ میں معلم محمد حسین غضنفر کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298-C کے تحت احمدیت کی تبلیغ کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ "اقبال جرم" کے لیے اسے اذیت پہنچائی گئی۔ وہ ابھی تک جیل میں بند تھا۔

گرفتاریاں: 1- لودھراں میں احمدیہ کمیونٹی کے سربراہ حمید اللہ باجوہ' سابق سربراہ محمد شریف چودھری اور ایک مبلغ احمدی کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعات 295-A اور 298-C کے تحت مقدمات درج کئے گئے اور 28 اپریل کو انہیں حراست میں لے لیا گیا۔ چار ماہ بعد حمید اللہ باجوہ اور محمد شریف چوہدری کو ضمانت پر رہا کردیا گیا لیکن نثار احمد کو ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کردیا گیا۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل پر یہی نہیں کہ سیشن کورٹ نے فیصلہ برقرار رکھا بلکہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے تحت توہین رسالت کے الزام کا مزید اضافہ کردیا۔ بالآخر 26 ستمبر کو لاہور ہائی کورٹ نے اسے ضمانت پر رہا کرنے کا حکم صادر کیا۔ ماتحت عدالت میں اس کے خلاف مقدمے کی سماعت ابھی شروع ہونی ہے۔

2- خوشاب کے طارق رانا کو اس شکائت پر حراست میں لے لیا گیا کہ وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرتا ہے اور لوگوں میں احمدیہ لٹریچر تقسیم کرتا ہے۔

3- اسی الزام کے تحت' ریاض احمد چوہدری اور تین دیگر افراد 21 نومبر 1993 سے میانوالی جیل میں بند ہیں ان کی ضمانت کی درخواست سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔

4- 23 جون کو قصور کے میاں محمد اسلم اور اعجاز احمد کو تعزیرات پاکستان کی دفعات 295-A اور 298-C کے تحت کلمہ اور قرآن پاک کی آیات مقدسہ کی نمائش کے جرم میں حراست میں لے لیا گیا۔ 15 اگست کو لاہور ہائی کورٹ نے انہیں ضمانت کا حکم صادر کیا۔

5- بھکر کے شیخ دبیر احمد کے خلاف 20 جولائی کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298-C کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔ اس پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے اپنی تقریر کے دوران السلام علیکم کہا تھا اور قرآن پاک سے ایک آیت کا حوالہ دیا تھا۔ اسے 14 اگست کو حراست میں لیا گیا اور دو

ہفتے بعد ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

6- 21 فروری کو نور پور تھل میں ایک سرکاری ملازم ڈاکٹر محمد اختر انچارج سول ہسپتال کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298-C کے تحت الزام عائد کیا گیا۔ وہ زیر حراست ہی تھا اس کے خلاف MPO-16 اور دفعہ 295-C کے تحت الزام کا اندراج کر لیا گیا۔ سیشن جج خوشاب نے اسے ضمانت پر رہا کرنے کا حکم جاری کیا۔ سرکار نے اس حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ ضمانت کی توثیق کرتے ہوئے ہائی کورٹ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ابتدائی طور پر مقدمہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298-C کے تحت درج کیا گیا تھا اور پہلی درخواست ضمانت کی سماعت کے دوران سرکار نے اس التواء کی التجا کی تاکہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کا اضافہ کیا جا سکے۔ ایف آئی آر میں ایسا ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے جو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے جزو ترکیبی کی توجہ حاصل کر سکے۔ بادی النظر میں ایسا کسی قانونی بنیاد کے بغیر کیا گیا ہے۔ عدالت عالیہ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ جب سرکاری وکیل سے یہ پوچھا گیا کہ حکومت ملزم کو جو ایک سرکاری ملازم ہے' ضمانت دیئے جانے کے خلاف ضرورت سے زیادہ جذباتیت کا مظاہرہ کیوں کر رہی ہے۔ تو واضح جواب یہ تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خوشاب عبدالحیم صادق چاہتا تھا کہ اس درخواست کو پیش کیا جائے۔

نفرت کی مہم: 22 جولائی کو گوئی' آزاد کشمیر کے مقام پر مجلس ختم نبوت کی طرف سے منعقد ہونے والے ایک احمدی مخالف جلسے میں احمدیوں کی مذمت کی گئی اور تحریک کے بانی کے خلاف سخت زبان استعمال کی گئی۔ 21 اپریل کو عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ربوہ میں نکالے گئے ایک جلوس میں احمدیوں کے خلاف نعرہ بازی کی گئی۔ حافظ آباد کے گاؤں منگت اچا میں احمدیوں کے خلاف مہم کو مزید تیز کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک تنظیم قائم کی گئی جس کا صدر اور سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اگست کے آخر میں اوکاڑہ میں احمدیوں کے خلاف ایک پوسٹر مہم کا آغاز کیا گیا۔ شہر کی دیواروں پر پوسٹرز اور سٹکرز چسپاں کیئے گئے ان پر اس قسم کے نعرے تحریر تھے۔

''قادیانی کتے نبوت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ مرزائیوں کو اس زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں' قادیانی کافر ہیں۔ انہیں ختم کر دیا جائے' قادیانیوں کا ایک ہی علاج جہاد' جہاد۔ قادیانی تاجروں کا

بائیکاٹ کرو' کلیدی عہدوں سے قادیانیوں کو ہٹاؤ' قادیانی کو کتا کہنا' کتے کی توہین ہے" وغیرہ۔ لندن میں احمدیوں کے مذہبی پیشوا کے خطبہ کی رواں نشریات کے پاکستان میں سنے جانے پر بھی غصے کا اظہار کیا گیا۔ مثال کے طور پر اس قسم کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ رحیم یار خاں میں کٹڑ حلقوں کی طرف سے دباؤ کے تحت ڈپٹی کمشنر نے چک نمبر123/NP میں چوہدری عنایت اللہ کے گھر پر چھاپہ مار کر ڈش انٹینا اور ریسیور کو قبضہ میں لینے کا حکم صادر کیا۔

طلباء کے خلاف کاروائی: تعلیم الاسلام ہائی سکول کے حافظ محمد اکبر کو صبح کی اسمبلی میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے پر سکول سے خارج کر دیا گیا۔ خرم جاوید کو ہوسٹل میں باقی طلباء سے علیحدہ بیٹھ کر' علیحدہ برتنوں میں کھانا کھانا پڑا۔ گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج' فیصل آباد کے منیر احمد کو بھی اسی قسم کے سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ زرعی یونیورسٹی' فیصل آباد کی ختم نبوت یوتھ آرگنائزیشن نے پانچ احمدی طلباء کو ہوسٹل سے نکلوا دیا۔ جو باقی رہ گئے ان کے لئے کھانے کا میز علیحدہ کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور اسے یہ ہدایت کی گئی کہ وہ دوسرے طالب علموں کے ساتھ ملنے جلنے سے احتراز کرے اور کھانا علیحدہ کھایا کرے۔

گورنمنٹ کالج' جھنگ کے ہوسٹل میں داخلہ کے لئے یہ حلف نامہ لینا پڑتا تھا کہ "امیدوار کا قادیانی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے" سرگودھا کی امت الشفیع کو صرف اس لئے کالج سے خارج کر دیا گیا کہ وہ احمدی تھی اور شعبہ قرآنی تعلیمات میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ راجن پور میں سکول کے ایک طالب علم کو احمدیت قبول کرنے کی پاداش میں ساری کلاس کے روبرو مارا پیٹا گیا۔ گورنمنٹ کالج' جڑانوالہ میں داخلہ حاصل کرنے کے خواہش مند ایک طالبعلم کو ہدایت کی گئی کہ وہ احمدی مسلک کو خیر آباد کہہ دے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے کیونکہ اس نے داخلہ کے فارم میں مذہب کے لئے مختص خانے میں اپنا مذہب اسلام ظاہر کیا تھا۔

ٹنڈو جام زرعی یونیورسٹی میں متعلقہ استاد نے ایک طالبعلم کو اسلامک سٹڈیز کی کلاس میں داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل پر وائس چانسلر نے اجازت تو دے دی لیکن امتحان کے روز استاد کی مرضی ہی چلی اس نے طالبعلم کو کمرہ امتحان سے باہر پھینکوا دیا۔

خاص طور پر ایک بہت ہی المناک واقع جس نے درسگاہوں اور دیگر مقامات پر واقع کٹڑپن کے

گڑھوں میں چلنے والی تعصب کی آندھی کو نمایاں کیا۔ وہ اکتوبر کے اوائل میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈاکٹر نسیم بابر کا قتل تھا۔ ڈاکٹر نسیم بابر کو کیوں قتل کیا گیا اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ سوائے اس کے کہ وہ احمدی تھے۔ ڈاکٹر نسیم بابر، فزکس کے استاد تھے۔ علم کے لیے لگن اور اپنی خوش خلقی کے حوالے سے وہ اپنے شاگردوں اور رفقائے کار میں بہت ہردلعزیز تھے۔ ان کے قتل نے یہی نہیں کہ اساتذہ میں خوف و ہراس پھیلا دیا بلکہ ملک کے طول و عرض میں اس کے خلاف انتہائی تشویش کا اظہار کیا گیا۔ بعد ازاں یونیورسٹی میں ان کے رفیق کار، صادق نیازی جو کیمسٹری پڑھاتے تھے، بھی اس جہان فانی سے انتقال فرما گئے۔ ان کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسلام آباد میں تعصب اور تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر کے خلاف تشویش کا اظہار کرنے کے چند منٹ بعد ہی وہ وفات پا گئے۔

سال کے اوائل میں علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور کے کٹڑ مہم جو عناصر نے گذشتہ واقعات میں ملوث مشتبہ افراد کی ضمانت پر رہائی کے بعد، پچھلے سال سے جاری موت کے کھیل کو مزید آگے بڑھایا۔ ملک کے پہلے وزیر خارجہ چوہدری محمد ظفر اللہ اپنے گھر میں مردہ پائے گئے۔

ٹاؤن شپ کے احمدی مبلغ رانا عبدالستار احمد اور اس کے بیٹے ریاض احمد کو اغواء کیا گیا۔ مزاحمت کرنے پر ریاض احمد کو اسی وقت مار کر ہلاک کر دیا گیا جبکہ رانا عبدالستار احمد کو اس بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گئے۔ بعد ازاں اسے لاہور کے قریب واقع ایک جگہ ستوقتلہ میں پھینک دیا گیا۔ چند روز بعد طلبہ نے ایک جلوس نکالا، انہوں نے ہاتھوں میں کتبے پکڑ رکھے تھے جن پر لکھا تھا "قادیانیوں کا ایک علاج الجہاد، ربوہ کے ایوانوں میں آگ لگا دو۔ مرزائیوں کا جو یار ہے اسلام کا غدار ہے" بعد ازاں رائزنگ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن، امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور اسلامی جمعیت طلبہ نے ایک مشترکہ احتجاجی جلسہ منعقد کیا اور احمدیوں کے خلاف ملک بھر میں ہڑتال کی دھمکی دی۔

احمدیوں کا صد سالہ جشن، شکائتوں، مظاہروں اور گرفتاریوں کا موقع بن گیا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج چنیوٹ کے طلباء نے اس مسئلہ پر ٹریفک بلاک کر دی۔ ریذیڈنٹ مجسٹریٹ ربوہ نے حکم جاری کیا کہ شکایات میں نامزد بیشتر افراد کے خلاف پرچے کاٹے جائیں۔ چنیوٹ سے ہزاروں افراد نے ربوہ کی طرف مارچ کیا۔ وہ احمدیوں کی طرف سے ادا کی جانے والی نماز شکرانہ اور مبینہ طور پر ایک حدیث

پاک کے ترجمہ میں روا رکھی گئی گستاخی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ سال کے لئے مرتب کئے گئے احمدیوں کے تمام پروگراموں پر پابندی عائد کر دی گئی جس میں کاسوف۔ او۔ کاشوف کے سلسلے میں منعقد کیا جانے والا اجتماع بھی شامل تھا۔

ربوہ کے مجسٹریٹ نے لندن میں مقیم احمدی رہنما، مرزا طاہر احمد، ان کے چچا زاد مرزا منصور احمد اور پانچ دیگر افراد کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعات B-298 اور C-298 اور 337-H/2 کے تحت 1984ء کے انسداد احمدیت ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے اور سیٹلائٹ پر اپنا پیغام نشر کرنے کے جرم میں گرفتاری کے احکامات بھی جاری کئے۔ پتوکی کے بشارت الحق، لطیف بیگ اور عامر بیگ سمیت دیگر کئی افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان پر یہ الزام عائد تھا کہ انہوں نے ان نشریات کو سننے کی خاطر ڈش انٹینا نصب کر رکھا تھا۔

تشدد کے دو واقعات میں، بہاول نگر میں قادیانی کا ملکیتی نسیم میڈیکل سٹور جلا دیا گیا اور جوہر آباد میں ایک احمدی اجتماع پر فائرنگ کی گئی۔

شہریوں کے حقوق کی ایک کمیٹی نے ربوہ میونسپل انتظامیہ کو یہ شکائت ارسال کی کہ احمدیوں نے شہر میں ایک قطع اراضی پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور وہ متعدد میونسپل بائی لاز کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ احمدیوں کو یہ ہدایت جاری کی گئی کہ وہ اپنا حقوق ملکیت ثابت کرنے کے لئے متعلقہ دستاویزات پیش کریں۔

یہ مطالبات بھی کئے گئے کہ احمدی اپنی عبادت گاہوں کی شکل اور صورت تبدیل کریں تاکہ ان کی مسلمانوں کی مساجد سے کوئی مشابہت نہ رہے۔ ربوہ میں منعقدہ، مجلس احرار کی سالانہ شہدائے ختم نبوت کانفرنس نے احمدیوں کو ان چار میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کے لئے کہا: مسلمان ہو جائیں، اقلیت بن جائیں، ملک چھوڑ جائیں یا اسلام میں مرتد کی جو سزا ہے اسے بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

ملک کے قدیم ترین شائع ہونے والے رسالے اور احمدیوں کے ترجمان ''الفضل'' کے خلاف جولائی میں ایک بار پھر کاروائی کی گئی۔ 1984ء میں انسداد احمدیت آرڈیننس نافذ العمل ہونے کے بعد سے ''الفضل'' اور دیگر احمدی مطبوعات مشکلات کا ہی شکار رہیں۔ احمدیت کا پروپیگنڈہ کرنے یا قرآن

مجید سے حوالہ دینے اور اسلامی رنگ اور روپ اختیار کرنے کے الزامات کے تحت اسے مقدمات کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے سے دوچار کر دیا گیا۔ اس پرچے کے خلاف پچاس مقدمات درج تھے۔

اس سے قبل جنوری میں جہلم کے ڈپٹی کمشنر نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298-C (خود کو بطور مسلمان ظاہر کرنا) کے تحت "الفضل" کے ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر اور ماہنامہ "انصار اللہ" کے دو ایڈیٹران کے خلاف مقدمات درج کئے۔ انہیں فروری میں اس وقت حراست میں لے لیا گیا جب سیشن جج چنیوٹ نے نہ صرف یہ کہ ان کی ضمانت کی درخواستیں مسترد کر دی بلکہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے تحت ان کے خلاف توہین رسالت کے الزام کا بھی اضافہ کر دیا جس کی سزا موت ہے، بالآخر ایک ماہ بعد انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ لیکن ان کے خلاف ان الزامات کے تحت مقدمات کی سماعت ابھی التواء میں پڑی ہوئی ہے۔

سال کے شروع میں سپریم کورٹ کے ایک فل بنچ نے بعض اپیلوں کو مسترد کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ 1984ء کا آرڈیننس نمبر xx بنیادی حق کے طور پر آئین میں فراہم کی گئی عبادت کی آزادی کی ضمانت کی نفی نہیں کرتا اور یہ کہ احمدیوں کی طرف سے شعائر اسلام (اذان دینا، کلمہ طیبہ کا استعمال وغیرہ) اختیار کرنا، امن عامہ کے لئے خطرہ پیدا کرنے کے مترادف ہے لہٰذا یہ خلاف قانون ہے۔

اس فیصلے پر نظرثانی کرنے کے لئے سپریم کورٹ میں ایک اپیل دائر کی گئی۔ ملاؤں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ وہی جج صاحبان نظرثانی کی اپیل کی سماعت کریں جنہوں نے فیصلہ صادر کیا تھا اور جن میں سے بعض جج صاحبان مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر بھی ہو چکے تھے۔ جولائی میں اس اپیل کی پہلی سماعت کے موقع پر انہوں نے سپریم کورٹ کا محاصرہ بھی کیا۔ انہوں نے اپنا محاصرہ صرف اس وقت ختم کیا جب وزیر داخلہ نے ختم نبوت کے ایک وفد کو یہ یقین دہانی کرائی کہ حکومت احمدیوں کے خلاف قانون کا سختی کے ساتھ تحفظ کرے گی۔

عجیب بات یہ تھی کہ 1994ء کے دوران احمدیوں کے خلاف درج ہونے والی ایف آئی آر میں سے بیشتر سرکاری ملازمین نے درج کروائی تھیں۔

متعصب حلقوں کی طرف سے حکومت کے خلاف کی جانے والی تنقید کا تکیہ کلام یہ تھا کہ یہ

احمدیوں کے متعلق ایک نرم گوشہ رکھتی ہے۔ حکومت کو پارلیمنٹ میں اپنا دفاع اس انداز میں کرنا پڑا کہ بیورو کریسی میں کلیدی عہدوں پر صرف 10 احمدی متعین ہیں۔۔۔ تین گریڈ 20 اور سات گریڈ 21 میں۔ اور یہ کہ ان کی موجودہ تعیناتی گذشتہ دور حکومت میں عمل میں آئی تھی۔ اپنے حریف کو احمدی کہہ کر بدنام کرنے کا حربہ' آزادی سے استعمال کیا جاتا رہا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ منظور وٹو احمدی نہیں ہیں بلکہ اس کے شہر میں بھی کوئی احمدی موجود نہیں ہے۔ اپنے وقت کے ایکٹنگ چیف جسٹس' جسٹس سعد سعود جان کو بھی اپنے آفس کے ذریعہ اس سلسلے میں ایک پر زور تردید جاری کرنا پڑی۔

احمدیوں کے خلاف شروع کی گئی مہم میں جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ انہیں غیر محب وطن اور غیر قوم پرست عناصر کے طور پر پیش کیا گیا۔ بالواسطہ طور پر ایک بات جو عام کہی گئی وہ یہ تھی کہ یہ کشمیر کے مسئلہ پر غداری کا مرتکب ہو رہے اور نام نہاد تھرڈ آپشن کے نظریہ کو فروغ بخش رہے ہیں جس کا مطلب کشمیر کی مکمل آزادی ہے۔

1995ء کا جائزہ

احمدیوں کے خلاف مقدمات

احمدیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے چھ افراد کے خلاف 10 سال پرانا مقدمہ دوبارہ کھڑا کر دیا گیا۔ ان چھ افراد کے خلاف اکتوبر 1984ء میں قتل کا ایک مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ (دفاع کی دلیل یہ تھی کہ عبادت گاہ پر حملہ کے دوران ان افراد نے صرف حق دفاع استعمال کیا تھا) اور ایک خصوصی ملٹری کورٹ نے اس مقدمہ کی سماعت کی تھی۔ ان میں دو ملزمان کو پھانسی کی سزا اور چار دیگر ملزمان کو سات سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ صوبائی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ان سزاؤں کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا۔ سماعت کی کارروائی پر چند اعتراضات کئے اور عدالت کو حکم صادر کیا کہ وہ اس مقدمے کا دوبارہ جائزہ لے۔ اپنے پہلے حکم پر نظر ثانی کرتے ہوئے' ملٹری کورٹ نے دونوں ملزمان کی موت کی سزاؤں کو بحال رکھا اور دیگر ملزمان کی سزاؤں کو سات سال قید بامشقت سے بڑھا کر تاحیات قید بامشقت کا حکم صادر کیا۔ ملزمان نے اس سلسلے میں لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کیا اور مقدمے کے

فیصلے کو بدنیتی پر مبنی قرار دیا۔ 1994ء میں لاہور ہائی کورٹ نے اس بنیاد پر انہیں رہا کرنے کا حکم جاری کیا۔ جیل میں رہتے ہوئے انہیں تقریباً دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ احمدیہ مخالف لابی نے، ہائی کورٹ نے اس فیصلہ کے خلاف" سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔ دسمبر 1995 میں اس اپیل کو منظور کر لیا گیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ساہیوال سے کہا گیا کہ وہ ملزمان کے خلاف وارنٹ جاری کرے۔

1995ء کے دوران، احمدیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے تیس افراد کے خلاف (1994ء میں 127) گیارہ نئے مقدمات (1994ء میں 27) درج کیے گئے۔ دفعہ 295-C کے تحت صرف ایک مقدمہ (1994ء میں 4) درج کیا اور نامزد کیے گئے ملزمان کی تعداد پانچ (1994ء میں 6) تھی۔

1995ء کے دوران جو مقدمات درج کیے گئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے: 1- احمد افضل، ضلع سرگودھا، زیر دفعہ 298-C اپنی دکان میں ایک کیسٹ چلانے کے خلاف۔ 2- شکیل احمد پٹھان، قاسم خان اور جمشید خان جھنگ، زیر دفعہ 298-C، 3- قمر اللہ، سجاد احمد، محمد یعقوب اور محمد جمیل ضلع گوجرانوالہ، زیر دفعہ 298-C، احمدیت کی تبلیغ کرنے کے جرم میں 4- ناصر احمد، حافظ آباد زیر دفعہ 298-C، 5- مشتاق احمد، منظور احمد، محمد احمد، سعید احمد اور محمد صدیق، ضلع فیصل آباد زیر دفعہ 298-C، 6- اعجاز حسین، ضلع خوشاب، زیر دفعہ 298-C بچے کی پیدائش پر اسے مسلمان ظاہر کرنے کی پاداش میں۔ 7- مبارک احمد، ضلع جھنگ، زیر دفعہ 295-/A صوبہ سرحد 8- طارق جاوید، ضلع ایبٹ آباد، زیر دفعہ 298/C، 9- عبدالمجید، محمد رفیق، امتیاز احمد اور منور احمد بھٹی ضلع تھرپارکر، زیر دفعہ 298/C، 10- عبدالطیف، ڈاکٹر محمد اسماعیل، اعجاز احمد اور ڈاکٹر مختار احمد، ضلع خیرپور زیر دفعہ 295/C

جن احمدیوں کو سزائیں سنائی گئیں

- ضلع شیخوپورہ میں ننکانہ صاحب کے نصیر احمد کے خلاف 1992ء میں سات دیگر افراد کے ساتھ جن میں نو ماہ کا ایک بچہ بھی شامل تھا۔ اپنی بچی کے شادی کارڈ پر اسلامی القاب تحریر کرنے کے جرم میں ایک مقدمہ درج کیا گیا۔ تمام افراد کو بالآخر اس مقدمے سے خارج کر دیا گیا۔ اس مقدمے کا اپریل 1995ء میں فیصلہ سنایا گیا۔ ملزم کو زیر دفعہ 295-A، چار سال قید، زیر دفعہ 298-C دو سال قید اور دفعہ 295-C کے تحت درج شدہ الزامات سے بری کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں لاہور ہائی کورٹ میں ایک اپیل دائر کی گئی جس کے تحت ملزم کو رہا کر دیا گیا۔

○ صوبہ سرحد میں، مانسہرہ پولیس اسٹیشن کے تاج محمد اور مبارک احمد کے خلاف زیر دفعات C-298-451 اور 506 مقدمات کا اندراج کیا گیا۔ مقدمہ 1992ء میں درج کیا گیا اس کا فیصلہ 1995ء میں ہوا۔ ملزمان کو زیر دفعہ C-298 ایک ایک سال قید بامشقت (مسجد میں نماز ادا کرنے کی پاداش میں) کر دی گئی۔ دفعات 451 اور 506 کے تحت الزامات (مسجد میں فساد) کی تصدیق نہ ہو سکی لہٰذا ان دفعات کے تحت مقدمات میں انہیں بری کر دیا گیا۔

قوانین

کئی قوانین کے تحت، خاص طور پر احمدیوں کے لیے مذہب کی آزادی بہت محدود کر دی گئی ہے۔ یہ قوانین احمدیوں کو

i- ان کو اپنے دعوؤں کے برعکس غیر مسلم قرار دیتے ہیں۔

ii- یہی نہیں کہ یہ انہیں مسلمان کہلوانے پر پابندی عائد کرتے ہیں بلکہ انہیں کوئی بھی ایسا نام لقب یا خطاب اپنانے، جس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق ہو اور مسلم طرز عبادت اختیار کرنے پر قدغن لگاتے ہیں۔

iii- کوئی بھی ایسی کارروائی کرنے سے منع کرتے ہیں جس میں اس بات کا شائبہ ہو کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

اپریل 1984ء میں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے جاری کیے گئے آرڈیننس کے تحت تعزیرات پاکستان میں دفعہ B-298 اور دفعہ C-298 کے ذریعے ان پابندیوں کو لاگو کیا گیا تھا۔ گذشتہ برسوں کی طرح 1995 میں بھی متعدد احمدیوں پر ان دفعات کے تحت الزامات عائد کئے گئے۔ ان پر مقدمات چلائے گئے اور انہیں سزائیں سنائی گئیں۔

ایسے متعدد واقعات بھی منظر عام پر آئے جب مذہبی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے جنونی گروہوں نے احمدیوں کو ہراساں اور خوف زدہ کیا۔ اپریل میں شب قدر میں رونما ہونے والے ایک واقعہ میں عدالت کے کمرے کے باہر ایک مشتعل ہجوم نے دو احمدی وکیلوں کو انتہائی تشدد کا نشانہ

بنایا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی ضمانت کے سلسلے میں عدالت میں آئے تھے جس نے حال ہی میں احمدیت قبول کی تھی۔ ان میں سے ایک کو پتھر اور ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا اور اس کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ دوسرے کو مردہ سمجھ دیا گیا۔ یوں وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ تیسرا ماحول کی تندی اور تیزی کا اندازہ لگاتے ہوئے ذرا پہلے ہی موقع سے بھاگ گیا۔

پولیس بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ بعد ازاں اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ اس جیسی صورت حال میں مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ اس واقعہ کے بعد بھی نہ تو کسی شخص کو حراست میں لیا گیا اور نہ ہی کسی پر کوئی الزام عائد کیا گیا۔ اس کی بجائے جس شخص نے احمدیت قبول کی تھی اور جس کی درخواست ضمانت پر دلائل دیئے جانے تھے اس کے خلاف دفعہ 298-C کے تحت خود کو مسلمان ظاہر کرنے اور احمدیت کا پرچار کرنے اور 295-C کے تحت مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کے الزامات کا اضافہ کر دیا گیا۔

1996ء کا جائزہ

احمدیوں کے خلاف مہم

کٹر قدامت پسند مسلمان طبقات نے انجمن تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم سے احمدیوں کے خلاف اپنی مہم بھرپور انداز سے جاری رکھی۔ ان کا الزام ہے احمدی نہایت موثر اور جذباتی انداز سے اپنے عقیدے کی تبلیغ کر رہے ہیں' اس لیے حکومت کو ان کے خلاف زیادہ سخت اقدامات کرنے چاہئیں۔ تشدد کے واقعات کے ایک تسلسل کے بعد کراچی میں ان انتہا پسند جنونیوں کی تنظیم نے ایک ہینڈبل شائع کیا جس میں کہا گیا کہ چونکہ پولیس ہم سے تعاون نہیں کرتی اس لئے ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں۔ اس ہینڈبل میں ناموس رسالت کے پروانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ تمام احمدیوں کو قتل کر دیں' تاکہ ان غیر مسلموں کو یہ پتہ چل سکے کہ مسلمان ماؤں نے غازی علم الدین شہید جیسے سپوت جننے بند نہیں کیے۔

غازی علم الدین شہید نے 1929ء میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک توہین آمیز

کتاب کے ہندو مصنف کو قتل کیا تھا۔

ایک شخص نے جو اپنے آپ کو احمدیوں کے خلاف ایک بین الاقوامی تنظیم کا سیکرٹری جنرل قرار دیتا ہے، بڑی سنجیدگی سے دعویٰ کیا کہ ملک میں ہونے والے تشدد اور دہشت گردی کے تمام واقعات کے پیچھے احمدیوں کا ہاتھ ہے۔ احمدیوں کے خلاف انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ منظم جماعتی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ مثلاً سندھ کی نگران حکومت کے ایک وزیر کی برطرفی کے لیے مہم چلائی گئی۔ سیالکوٹ میں لیڈی اینڈرسن ہائی سکول کی پرنسپل کو احمدی قرار دے کر نکالنے کا مطالبہ کیا گیا۔ احمدیوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی مہم کا سلسلہ کسی نہ کسی انداز سے مسلسل جاری رہا۔ کچھ واقعات کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

- کراچی میں الائیڈ بنک کے ایک ملازم ظفر اقبال کو اس کے گھر کے قریب، اس کی کار سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور قتل کر دیا گیا۔
- فیڈرل بی ایریا کراچی میں ایک احمدی دکاندار اور اس کے رشتہ دار کو بری طرح پیٹا گیا۔ مارنے والے انہیں شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ انجمن سپاہ صحابہ خوشاب کے کارکن ظہیر احمد نے اپنے ایک قریبی دکاندار مبارک احمد کو چھرا گھونپ دیا۔
- ایبٹ آباد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد سڑک پر آنے والے احمدیوں کی سرعام پٹائی کی گئی اور پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔
- راجن پور میں جماعت احمدیہ کے مقامی سربراہ میاں اقبال احمد ایڈووکیٹ کے خلاف دفعہ 295-C کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔ سیشن عدالت نے مقدمہ خارج کرنے کے لیے ان کی درخواست مسترد کر دی۔
- سانگھڑ میں سرکاری وکیل نے مختار احمد کی درخواست ضمانت کی مخالفت کی۔ ان کے خلاف اسلامی عقائد کی توہین کا مقدمہ دفعہ 295-C کے تحت درج کیا گیا تھا۔ حالانکہ اسی مقدمے میں ملوث کیے گئے منظور احمد کو شہادت نہ ہونے کی بناء پر رہا کر دیا گیا تھا۔
- منڈی احمد آباد، دیپال پور ضلع اوکاڑہ میں مولوی جمیل احمد نے ایک مقامی احمدی شخصیت چوہدری نصیر الدین کے خلاف تقریروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک دن مولوی جمیل احمد اور

اس کے ساتھیوں نے چوہدری نصیرالدین کے ساتھ تلخ کلامی کے بعد ان کے خلاف دفعہ 506 کے تحت مجرمانہ دھمکیاں دینے اور دفعہ 298-C کے تحت احمدی عقائد کا پرچار کرنے کا مقدمہ درج کروا دیا۔ اپنے گھر پر قرآنی آیت آویزاں کرنے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ پولیس نے چوہدری نصیرالدین کو گرفتار کر لیا اور ان کی درخواست ضمانت مسترد کر دی گئی۔

- ظہور احمد ابڑو اور نور حسین ابڑو پر پہلے اپنی موٹر سائیکل پر کلمہ آویزاں کرنے کا الزام لگایا گیا' پھر دفعہ 298-C کے تحت احمدیت کی تبلیغ کرنے' 298-A کے تحت دوسروں کے مذہبی جذبات کی توہین کرنے اور دفعہ 295-C کے تحت توہین رسالت کرنے کے الزامات بھی شامل کر دیے گئے۔ ان کی ضمانت کی درخواستیں تین بار مسترد کی جا چکی ہیں۔
- سیالکوٹ میں دو افراد اعجاز احمد اور نصیر احمد بسرا' گوجرانوالہ میں چھ افراد اور لاڑکانہ میں دو افراد پر احمدیت کی تبلیغ کا الزام لگایا گیا اور ان کی ضمانتیں نہیں ہو سکیں۔
- ربوہ میں احمدیوں کی عبادت گاہ "بیت المہدی" میں بم پھٹنے سے 15 افراد زخمی ہوئے جن میں ان کے مقامی سربراہ اسلم صابر بھی شامل تھے۔
- کراچی میں 12 افراد کے گروہ نے احمدیوں کی عبادت گاہ "بیت الذکر" کے باہر فائرنگ کی' کھڑی ہوئی کچھ گاڑیوں کو آگ لگائی اور کچھ گاڑیاں لے گئے۔
- کراچی میں دو خواتین بشریٰ تاثیر اور سیما بخاری ایک کپڑا سلائی کے لئے درزی کے پاس لے گئیں۔ درزی نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ کپڑے پر قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں' بشریٰ تاثیر پر چاقو سے وار کئے' جن کے نتیجے میں وہ زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو گئی۔ دونوں خواتین کے خلاف دفعہ 295-C اور 298-C کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔ بعد میں عدالت نے کہا کہ کپڑے پر ایک ڈیزائن بنا ہوا تھا' قرآنی آیات نہیں تھیں۔
- مانسہرہ سے 15 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع کھواڑی کے ڈسپنسر خالد احمد کو ڈاکٹر رانا منور احمد نے اپنے فرائض ادا کرنے کے بارے میں تنبیہہ کی۔ اس کے ردعمل میں اس نے ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کو دھمکی دی کہ اس قادیانی ڈاکٹر کو تبدیل کیا جائے ورنہ عوام اس کے خلاف احتجاج کریں گے۔

○ محکمہ ڈاک کے حکام کو اطلاع دی گئی کہ شعبہ سارٹنگ (SORTING) کا ملازم مولوی یعقوب، جس کا تعلق ملک کھوکھر گجرات سے ہے احمدیوں کے خطوط کھولتا ہے اور پڑھنے کے بعد ضائع کر دیتا ہے۔

○ فرحان ماڈل سکول چکوال کے ملک ریاض احمد کے خلاف صرف اس لیے مقدمہ قائم کیا گیا کہ اس نے سکول کا نتیجہ سنانے کے لیے لاؤڈ سپیکر استعمال کیا تھا۔ بچوں کے والدین کو اس سکول سے بچے اٹھانے کی تلقین بھی کی گئی۔

○ چکوال میں محکمہ تعلیم پر دباؤ ڈالا گیا کہ ایک خاتون احمدی کو گورنمنٹ سکول سے نکالا جائے۔ دو احمدی بھائیوں کی فلور مل کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ان کو کاروبار سے بھگانے کے لیے مقابلے میں فلور مل لگائی گئی۔ ایک اور احمدی دوکاندار ملک رشید کو کرائے کی دکان سے نکال دیا گیا۔

○ احمدیوں کے مرکز ربوہ میں قاری شبیر عثمانی نے اقصیٰ چوک میں کھڑے ہو کر قادیانیوں کو گالیاں دیں۔ ایک روز رات آٹھ بجے چناب ایکسپریس ربوہ سٹیشن پر رکی تو مسافروں کے ایک گروہ نے گاڑی سے اتر کر احمدیوں کے خلاف اس وقت تک شدید قسم کی نعرے بازی کی جب تک گاڑی وہاں سے روانہ نہیں ہو گئی۔

○ اقصیٰ روڈ کالج کے کچھ لڑکوں نے خریداری کے لیے آئی ہوئی دو لڑکیوں پر آوازے کسے، جب ان کے بھائی نے احتجاج کیا تو وہ لڑکے تھوڑی دیر بعد 15 مسلح آدمیوں کے ساتھ پھر آ گئے تاکہ انہیں سبق سکھا سکیں۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قانون اندھا ہوتا ہے، پولیس نے دونوں پارٹیوں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔

○ فیصل آباد کی ایک فیکٹری کا سپلائر نصیر احمد اپنے شناسا کو ایک رات ٹھہرانے کے لیے اپنے گھر لایا۔ مگر اس کا مہمان فائرنگ سے اس کی جان لے کر رخصت ہوا۔

○ مولانا اللہ یار ارشد نے مقامی عدالت میں جماعت احمدیہ ربوہ کے سربراہ کرنل ایاز محمود اور ان کے تین ساتھیوں کے خلاف استغاثہ دائر کیا کہ وہ انہیں قتل کرنے کی سازش کر رہے ہیں لیکن اپنے الزام کے حق میں کوئی شہادت پیش نہ کر سکے۔

- 23 مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر ربوہ میں احمدی بچوں نے ایک واک کا پروگرام ترتیب دیا۔ بچوں نے جو پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے ان پر اس طرح کے نعرے درج تھے مثلاً "علم بڑی دولت ہے" یا "خدا عاجزی سے خوش ہوتا ہے" قادیانیت کے مخالفین اس پر بھی ناراض ہو گئے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ان نعروں کا یوم پاکستان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ واک دراصل اس دن کی یاد منانے کے لیے ترتیب دی گئی ہے، جس دن 107 برس پہلے تحریک احمدیہ کے بانی نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

واک کے منتظمین مدثر احمد اور بشیر احمد کے خلاف 298-C اور دفعہ 188 کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔ ان کی ضمانت کی توثیق نہیں کی گئی۔

- ربوہ میں احمدیوں نے اپنی ایک پرانی اور خستہ حال عبادت گاہ کا ایک حصہ مسمار کیا تاکہ اسے دوبارہ تعمیر کریں۔ لیکن انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔
- ایبٹ آباد میں احمدیوں کو دو سال قبل جلائے گئے بیت الذکر دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ (اب احمدی اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ لفظ مسلمانوں کی عبادت گاہ کے لیے استعمال ہوتا ہے) چونکہ جمعہ کی ہفتہ وار عبادت اجتماعی طور پر ہی کی جا سکتی ہے، اس لیے احمدیوں نے 77- تنولی ہاؤس سکندر آباد کا نچلا حصہ کرائے پر لے کر وہاں جمعہ کی عبادت کا اجتماع شروع کر دیا۔ احمدی مخالف تنظیم ختم نبوت یوتھ فورس کے نقطہ نظر میں چونکہ احمدیوں کو اس طرح کی عبادت کی اجازت نہیں دی جا سکتی، لہٰذا انہوں نے احمدیوں کے خلاف طاقت کا استعمال شروع کر دیا۔

انتظامیہ نے جب دیکھا کہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو رہی ہے تو اس نے بنیادی سبب کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنوری کے وسط میں پولیس نے ایک جمعہ کے روز عبادت میں شریک ہونے والوں کے نام پتے حاصل کیے۔ بہت سے احمدیوں کو دفعہ 151/107 کے تحت غیر قانونی اجتماع اور سازش کرنے اور دفعہ 298-C کے تحت احمدی عقائد کی تبلیغ کرنے کے جرم میں حراست میں لیا۔ اس عمارت کے اوپر رہائش پذیر افغان کرایہ دار کو کسی دوسری جگہ بھجوا دیا اور آخر کار اس پوری عمارت کو سیل کر دیا۔

○ بدین میں ایک گروپ نے مطالبہ کیا کہ بیت الذکر پر کلمہ مٹایا جائے اور محراب کو ختم کیا جائے کیونکہ یہ بھی مسلمانوں کی مسجد کی علامت ہے اور مسلم فن تعمیر کی روایت ہے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر ان کی خواہش کے مطابق یہ تبدیلی نہ کی گئی تو وہ خود عمارت کو گرا دیں گے۔

○ خوشاب میں ایک گرداور (محکمہ مال کا اہلکار) نے اتنا صبر بھی نہیں کیا۔ وہ پولیس کو ساتھ لے کر آیا اور چالیس سال پرانی لکھی ہوئی آیات کو مٹا دیا۔

○ ملک میں کئی مقامات پر احمدیوں کے خلاف کلمہ لکھنے یا لگانے کے جرم میں مقدمات درج کئے گئے۔

○ ضلع چکوال کے گاؤں ڈلمیال میں 300 افراد نے احمدیوں کی سو سال پرانی عید گاہ اور جنازہ گاہ کی چار دیواری گرا دی۔

○ رحیم یار خان میں احمدیوں کی عبادت گاہ پر سے ڈش انٹینا اتار دیا گیا جو جمعہ کو لندن سے جماعت احمدیہ کے سربراہ کی تقریر دیکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ عبادت گاہ کے امام مولوی بشارت احمد کو دفعہ 298-C کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

احمدی عقائد کو اختیار کرنا سماجی اعتبار سے ناقابل قبول بنا دیا گیا ہے۔

○ سکھیکی میں محمد نواز نے احمدیت اختیار کی تو اسے مار مار کر بری طرح زخمی کر دیا گیا اور سماجی بائیکاٹ کر کے اسے اچھوت بنا دیا گیا۔

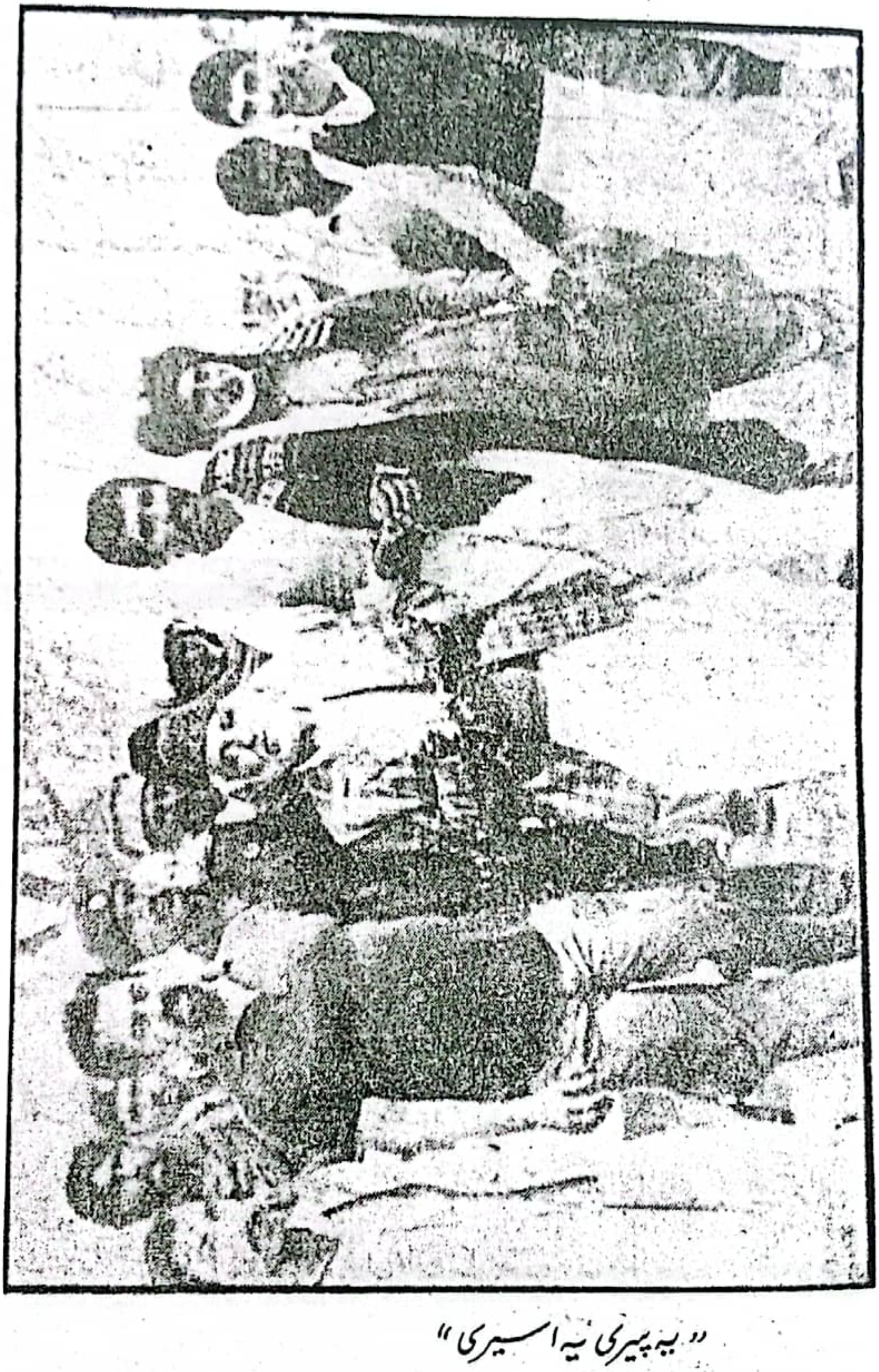
○ شیخوپورہ میں محمد اقبال کی منگیتر کے والدین جو اس کے قریبی رشتہ دار بھی تھے' اس کے احمدیت اختیار کرنے کو ایک سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتے تھے' اس لئے انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی محمد اقبال کے ساتھ کر دی۔ دو ماہ بعد انہیں عقل آئی تو نہ صرف انہوں نے شادی کو ختم کیا بلکہ محمد اقبال کے خلاف دھوکہ دہی' زنا اور احمدیت کا پرچار کرنے کے لئے مقدمات درج کروائے۔

○ جلال پور بھٹیاں کے اللہ دتہ کے خلاف بھی دفعہ 298-C کے تحت مقدمہ درج کیا گیا کیونکہ اس کی بیوی کے بھائی عمر حیات نے اس کے خلاف شکایت کی تھی کہ وہ اپنے خاندان کو احمدیت اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

حوالہ: پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال [illegible]



"خانۂ خدا کی مسماری کی ایک جھلک"
احمدیہ مسجد مردان مکمل طور پر تباہ کر دی گئی ۔

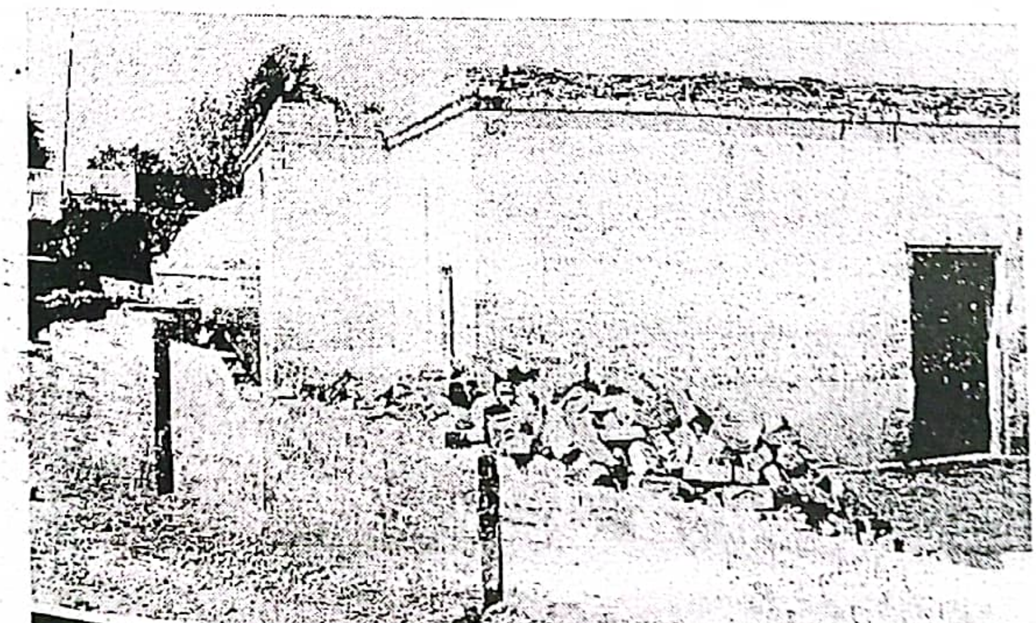


"یہ پیری یہ اسیری"

جنرل ضیاء الحق کی مذہبی تنگ نظری کا شکار، جناب خان محمد صاحب امیر ڈیرہ غازی خان۔



Copies of the Holy Quran burnt by the attacking mob at Mubashar Ahmad's house.



Damage done to the Ahmadi Prayer Centre at Chak 563 GB.



جناب عبدالکریم ابڑو (مدرس) صدر لوکل احمدیہ کمیٹی ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۸۳ء
بمقام وارزہ ضلع لاڑکانہ سندھ سوتے ہوئے قتل کیا گیا۔

خصوصی مقالہ

پاکستان میں جمہوریت اور مذہبی سیاست

ڈاکٹر جینیفر. بینٹ

جمہوری اعتبار سے کسی بھی قوم اور ریاست کا مقصد اپنے شہریوں کے لئے انصاف' آزادی اور مساوات بہم پہنچانا ہے۔ کسی کی ذات' عقیدہ' مذہب یا رنگ سے بالاتر ہو کر مساوی مواقع فراہم کرنا اور اپنے شہریوں کی حفاظت ہی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اگرچہ یہ خیالات مثالیت پسندانہ معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل جمہوری انداز سے ملک کو چلانے کا آخری منتہا یہی ہیں۔

اس مقالہ میں ہم آزادی کے بعد سے مساوات اور جمہوری سیاسی کلچر کے نہ بننے کا جائزہ لیں گے۔ یہاں یاد رہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے قانون ساز اسمبلی کی اپنی مشہور تقریر میں واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں کسی بھی امتیاز سے کام نہیں لیا جائے گا اور سیاسی معنوں میں شہریوں کا مذہب کچھ بھی نہیں ہو گا۔ یوں ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کو جمہوری ریاست بنانے کے ان وعدوں کے برعکس یہاں مساوات کے اصولوں سے انحراف کیا گیا اور ایسی سیاسی وسماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو بنیاد پرست مسلم گروہوں' مذہبی بنیاد پرستی' نسلی' صنفی جبر' اور اقلیتوں پر ظلم کا باعث بنی ہیں۔ خود ریاست نے مخصوص نظریہ کو بنیاد بنا کر معاشرے کے کمزور گروہوں' غریبوں' خواتین' مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے خلاف ظلم کی سرپرستی کی ہے۔

تاریخی مسائل

پاکستان بنانے والوں کے پیش نظر اسلامی ریاست نہیں بلکہ مسلمانوں کی ریاست تھی۔ تاہم مخصوص تضادات اور مسلم لیگ کی سیکولر قیادت میں باہمی کشمکش کے نتیجہ میں 1949ء میں قرارداد مقاصد منظور ہو گئی۔ 1956ء' 1962ء اور 1972ء کے آئین میں اسی قرارداد کے دائرہ میں رہ کر اسلامی تعلیمات کو جگہ دی گئی تھی لیکن 1977ء میں ضیاء الحق نے اسلامائزیشن کا عمل شروع کیا۔ اور 1985ء میں آٹھویں ترمیم کے تحت ان "اسلامی" قوانین کو عدالتی نظرثانی کے دائرہ کار سے باہر کر دیا۔

پاکستان میں شروع دن سے ریاست کی "مسلمانیت" کا تصور واضح نہیں تھا اور سیاسی قیادت اس پر واضح موقف نہیں رکھتی تھی۔ بعض علماء جو پاکستان بننے کے شدید مخالف رہے تھے اب یہاں اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مولانا مودودی انہی میں شامل تھے۔ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ ریاست کے مقابلہ پر خود مسلم لیگ کے پاس زیادہ اختیارات نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی برس تک پاکستانی آئین نہیں بنایا جا سکا۔ اس کے علاوہ یہ آئینی ابہام بھی پیدا ہوا کہ مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناح کو غیر معمولی اختیارات سونپ دیئے حالانکہ وہ گورنر جنرل تھے اور پارلیمانی نظام میں یہ اختیارات وزیراعظم کے پاس ہوتے ہیں۔ ان کی موت کے بعد چونکہ نوابزدہ لیاقت علی خان کو زیادہ عوامی حمایت حاصل نہیں تھی اس لئے انہوں نے 1949ء میں قرارداد مقاصد منظور کروا لی اور یوں جمہوریت کی بجائے تھیوکریسی کی بنا ڈالی گئی۔ لیکن پھر بھی سیاسی قیادت میں کوئی واضح موقف موجود نہیں تھا جبکہ غلام احمد پرویز' مولانا شبیر احمد عثمانی مذہبی بنیادوں پر قیام پاکستان کی حمایت کرتے تھے اور مولانا مودودی نے ابتدائی طور پر اس کی مخالفت کی تھی۔ لیکن ان سب علماء میں یہ اتفاق تھا کہ ریاست کا بنیادی کردار' اسلامی ہونا چاہیے۔ جمعیت العلمائے پاکستان نے تعلیمات اسلامی کا بورڈ قائم کرنے کا مطالبہ کیا جسے قانون ساز اسمبلی کی بیسک پرنسپلز کمیٹی نے منظور کیا۔

اسلامائزیشن کا عمل اور خواتین

جنرل ضیاء الحق کو اپنے اقتدار کو جائزیت دلوانی تھی۔ اس لئے انہوں نے شریعت کے نام پر تمام قانونی ڈھانچے کو تہس نہس کر دیا۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد سیاسی مفادات کے لئے اسلام کا نام سب سے پہلی بار ذوالفقار علی بھٹو نے استعمال کیا۔ پاکستان کا پہلا جمہوری آئین بناتے وقت ان پر مذہبی سیاسی جماعتوں اور بقول طارق علی، سعودی عرب نے دباؤ ڈالا۔ تاہم ان کے یہ اقدامات دل سے نہیں لئے گئے تھے اور فقط اپنی مقبولیت بڑھانے کا ایک ذریعہ تھے۔ بھٹو نے اسلامی ریاست کے ساتھ ساتھ سوشلسٹ نظریہ حیات سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کے لئے اسلامی سوشلزم کا نعرہ اپنایا۔

ضیا الحق اسلامائزیشن کے عمل کو پچھلی حکومتوں کا تسلسل نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے اوائل 1979ء میں مولانا مودودی کا سیاسی ماڈل لاگو کرنا شروع کر دیا یہ ماڈل نظریاتی طور پر سعودی عرب کی وہابی اشرافیہ سے منسلک تھا۔ اسے رجعت پسند سمجھا جاتا ہے اور اس میں طاقت کے ذریعے اسلام پھیلانے کی بات کی جاتی ہے۔ مولانا نے 1965ء کے انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی صدارتی مہم میں ان کی حمایت کی تھی جبکہ انہی کی جماعت اور دوسرے بنیاد پرست تقریباً 2 ہزار مولویوں نے جلوس نکال کر بے نظیر بھٹو کی سربراہی کی مخالفت محض اس لئے کی کیونکہ ان کے خیال میں کوئی عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ اسلام کے اسی موقع پرستانہ استعمال کے بارے میں علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ بادشاہوں، شہزادوں اور آمروں نے اپنے آپ کو جائز منوانے کے لئے صدیوں سے اسلام کو استعمال کیا ہے اور بغاوت و انقلاب کا راستہ روکنے، اپنے غلبہ کو برقرار رکھنے کے لئے اس کو بطور ڈھال استعمال کیا ہے۔

جماعت اسلامی اور دوسرے رجعت پسند عناصر عورتوں کی محکومیت کے قائل ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ عورت کو چار دیواری کے اندر رہنا چاہئے اور کسی عوامی یا سیاسی شعبہ میں ان کے داخلے پر پابندی ہونی چاہئے۔ ان کا خیال ہے کہ عورتیں ہی تمام سماجی بیماریوں کی جڑیں ہیں۔ وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

حدود کے تحت سزائیں

ضیا دور میں اسلامی پینل کوڈ لاگو کر دیا گیا۔ اگرچہ ان سزاؤں کے پوری قوم پر بہت بڑے نفسیاتی اثرات پڑے تاہم بدترین اثرات زنا اور زنا بالجبر کے آرڈیننس کے تھے جن سے خواتین کے لئے انصاف اور اپنے دفاع کے حقوق پر زد پڑی۔ حدود قوانین کچھ یوں بنائے گئے ہیں کہ اس کا شکار ہونے والی خواتین ہی بالاخر سزا کی حق دار ٹھہرتی ہیں۔ کیونکہ انہیں چار صالح مرد مسلمان گواہوں کی شہادت چاہئے ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گواہی نہ لائی جا سکے تو ان پر قذف لاگو کر دی جاتی ہے۔ ایسے بہت سے کیس موجود ہیں جہاں زنا یا زنا بالجبر کی ملزم خواتین کو سزائیں دی گئیں۔ ایسے ہی ایک کیس میں ایک اندھی لڑکی صفیہ بی بی کو ایک زمین دار اور اس کے بیٹے نے زنا بالجبر کا شکار کیا' الٹا اسے سزا ملی اور مرد کھلے دندناتے پھرتے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے گھروں سے باہر نکلنے والی خواتین پر نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

1981ء میں قصاص و دیت کا قانون لاگو کیا گیا۔ اس کے مطابق اگر کسی عورت کو زخمی یا ہلاک کیا گیا تو اس کے ازالے کے لئے دی جانے والی رقم مضروب مرد یا متوفی مرد کی نسبت آدھی ہو گی۔ حدود آرڈیننس کے تحت کسی غیر مسلم کے گھر میں چوری' حملہ یا زنا بالجبر کی نیت سے داخل ہونے والوں کو بھی عملاً سزا نہیں مل سکے گی کیونکہ وہاں چار صالح مسلمان مردوں کی گواہی دستیاب نہیں ہوتی۔ کمزور' غریب' اقلیتیں اور بالخصوص خواتین ہی حدود آرڈیننس کی سزاوار ٹھہریں گی۔

تاہم یہ امر یاد رہے کہ حکمران اشرافیہ کے دائیں بازو اور اقلیتی اسلام پسندوں مثلاً مذہبی مولویوں نے ہی ان قوانین کی حمایت کی تھی جبکہ پاکستانی آبادی کے ایک بڑے حصہ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ 25 فیصد شیعہ آبادی' دانشوروں کے گروہوں اور خواتین نے اسے پسماندہ و امتیازی قرار دے کر اس کی مخالفت کی۔ ایک طرف تو ایسے قوانین پر زور رہا جبکہ دوسری جانب اس عہد میں سماجی' معاشی حالات' نسلی فسادات' کرپشن اور اقربا پروری کو درست کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ ہیلتھ کے شعبہ کو نظر انداز کیا گیا۔ یوں ضیاء الحق نے معاشرے کی قدرتی ترقی کو روکا اور نفسیاتی طور پر تباہ کیا۔ کرپشن پر کوئی قانون سازی نہیں کی گئی اور غربت کو خدا کی مرضی قرار دے کر کھلا چھوڑا گیا۔ جرائم کو نظر انداز کیا گیا بلکہ درحقیقت یہ شبہ بھی ظاہر کیا جاتا

ہے کہ اپنے آپ کو جائز قرار دینے کے لئے ریاستی سرپرستی میں دہشت گردی کی گئی۔

آزادی کے بعد وراثتی قوانین اسلامی فریم ورک میں ہی رہنے دیئے گئے تھے۔ تاہم صدر ایوب کے زمانہ (69-1958ء) میں خواتین کے کام کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ اسی دور میں 1961ء کا عائلی قوانین کا آرڈیننس منظور کیا گیا جس کا بڑا مقصد کثیر ازدواجیت کی حوصلہ شکنی اور طلاق، تمام شادیوں کی لازمی رجسٹریشن اور شادی کا ایک مسلمہ معاہدہ تھا۔ لیکن ان وراثتی اور عائلی قوانین میں ایسی کوئی شق نہیں رکھی گئی تھی کہ اگر انہیں پامال کیا گیا تو کیا قدم اٹھایا جائے گا نہ ہی ان میں یہ حقیقت مدنظر رکھی گئی کہ تمام صنف زدہ نظریہ بنیادی طور پر گھروں سے جنم لیتا ہے۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں خواتین کے لئے مساوی حقوق کی گارنٹی دی گئی۔ یو این اعلامیہ برائے حقوق نسواں پر دستخط کئے گئے، خواتین کا کمیشن اور ویمنز انسٹی ٹیوٹ بنائے گئے اور دونوں اصناف کے لئے تعلیم عامہ کا اصول وضع کیا گیا۔ بالخصوص اوپری طبقے نے اسے سراہا حالانکہ درحقیقت یہ زیادہ اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ کیونکہ ان اقدامات کو مستقل کرنے یا انہیں بامعنی بنانے کے کام بہت کم کئے گئے۔ مثلاً بھٹو کے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دلانے، شراب پر پابندی سے اسلامسٹ طاقتوں کو شہہ ملی۔

ضیا حکومت کے اپنے تضادات تھے۔ ایک طرف حکومت غیر ملکی امداد پر انحصار کر رہی تھی اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی جانب سے اس پر خواتین کو ترقی کے عمل میں شامل کرنے کا دباؤ تھا جس کے تحت پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ویمنز کمیشن بنایا گیا جس کی سربراہ حقوق نسواں کی ایک کارکن تھیں۔ دوسری طرف ضیا دور میں ترقی کے عمل کو مزید نقصان پہنچا۔ ایک کے بعد ایک قانون سازی ایسی کی گئی جس سے مذہبی کٹرپن کے راستے کھولے گئے۔ تمام خاتون ملازمین، کالجوں میں اساتذہ اور طالبات پر چادر اوڑھنے کی پابندی لگا دی گئی۔ چادر کے لئے مارکیٹ پیدا کی گئی۔ اور لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوششیں کی گئیں کہ پاکستان ایک اسلامی پاکستانی شناخت حاصل کر رہا ہے۔ تاہم یہ اصول نچلے طبقے کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والی سکول کی لڑکیوں کے لئے وضع کئے گئے تھے تھے اور اشرافیہ، بورژوا اور تعلیم یافتہ پیشہ ور گروہ عملاً ایسی پابندیوں سے بچے رہے۔

پاکستان میں زیادہ تر یونیورسٹیاں مخلوط تعلیم پر مشتمل ہیں۔ 1977ء میں جماعت اسلامی نے اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اس کے خاتمہ کا اعلان کیا اور خواتین کے لئے تعلیم اور کام کے دوسرے شعبوں میں مکمل علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ فوجی حکومت کے دباؤ اور خواہش کے باوجود ایسی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ تاہم فزکس اور کیمسٹری سے لے کر معاشیات اور نفسیات ایسے مضامین تک کو اسلامائز کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ اسلامی جمعیت نے اساتذہ اور طلبا و طالبات بالخصوص خواتین کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔ سوال پوچھنے کی آزادی سلب کی گئی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں سے قابل اساتذہ اور محققین باہر نکالے گئے۔ ہوسٹلوں کے اردگرد اونچی دیواریں کھڑی کی گئیں۔

دفتروں میں ایسا ماحول بنایا گیا کہ نظریہ پسندوں کے ڈر سے لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو یونیورسٹیوں، آفس یا فیکٹری سے نکالنا شروع کیا۔ انٹیلی جنس کے لوگ جوڑوں کو ہراساں کرتے تھے۔ اسلام کے داعی کہتے تھے کہ عورت کا مقام گھر ہے اور اگر اس نے چادر نہیں اوڑھی تو جنسی حملے کی ذمہ داری اسی کی ہو گی۔ کیونکہ کوئی مرد ساتھ ہونا چاہیے۔ حقوق نسواں کی حامی خواتین کو مختلف اور غیر متعلقہ کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔

پردے اور خواتین کی علیحدگی کے لئے میڈیا استعمال کیا گیا۔ ڈراموں اور دوسری پروڈکشنز میں عورتیں باادب اور مرد بارعب دکھائے جاتے تھے۔ ٹی وی پر سنسرشپ لگائی گئی۔ 1988ء میں ضیاء الحق کی اچانک موت کے بعد بے نظیر حکومت آئی اور اس نے دعویٰ کیا کہ وہ خواتین کے خلاف برتے جانے والے ہر قسم کے امتیاز ختم کر دے گی۔ تاہم کچھ بھی ہونے سے پہلے ان کی حکومت 6 اگست 1991ء کو برطرف کر دی گئی۔ اکتوبر 1997ء میں بے نظیر حکومت دوبارہ برسراقتدار آئی اور اس وقت سے خواتین کے تمام شعبوں میں کام کرنے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

اب خاصی این جی اوز بن چکی ہیں۔ عورت فاؤنڈیشن، شرکت گاہ، ویمنز ریسورس سینٹر وغیرہ تو فقط حکومت کے گھریلو اور دوسرے مسائل کے حوالے سے کام کر رہی ہیں۔ حقوق نسواں کا پیغام، صنفی مساوات، عورتوں کے کام کرنے اور انہیں فیصلہ سازی میں شامل کرنے کے

سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ تاہم سیاسی اور قانونی اعتبار سے کوئی فیصلہ کن اقدامات نہیں اٹھائے جا رہے۔

اقلیتیں اور توہین رسالت کے قوانین

اس حصہ کا تعلق مذہبی جرائم سے متعلق ان قوانین سے ہے جو نو آبادیاتی دور سے چلے آئے ہیں اس کے علاوہ یہ حصہ ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کے دور تک محیط ہے۔ پاکستان پینل کوڈ میں دفعہ 295- سی' توہین رسالت کے قانون کا شامل کیا جانا اسی میں شامل ہے۔ ان قوانین سے اقلیتوں کے خلاف جرائم میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ پہلے موجود قانون میں تمام لوگوں کے مذہبی جذبات کا تحفظ شامل تھا۔ موجودہ پینل کوڈ قانون میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا جرم قرار نہیں دیا گیا بلکہ جرم کو اسلام کی توہین یا گستاخی کے معنوں میں لیا گیا ہے۔ ان جرائم میں پیغمبر اسلام' ان کے ساتھیوں اور اہل خاندان کی توہین یا بے حرمتی یا قرآن کی بے حرمتی شامل ہے۔ احمدیوں کے لئے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے کو بھی جرم قرار دے دیا گیا۔

1980 کی دہائی میں پاکستان پینل کوڈ (پی پی سی) میں مزید اضافے اور ترامیم کی گئیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتدار پر قبضہ کرنے' اقلیتوں کو اخلاقی' سماجی اور معاشی طور پر کمزور کرنے اور فقط چند جنونی گروہوں کو خوش کرنے کے لئے اسلام کے ان بزعم خود محافظوں نے قانونی اختیارات کو کس حد تک پامال کیا۔ تاریخی اعتبار سے پی پی سی میں تبدیلیاں یوں رونما ہوئیں:

1980ء میں پی پی سی میں دفعہ 298- اے کا اضافہ کیا گیا جس کے تحت کسی بھی شکل میں اسلام کے معزز لوگوں کی شان میں گستاخانہ فقروں کو تین سال تک قابل سزا قرار دیا گیا' جبکہ 1982ء میں 295 بی نافذ کی گئی جس میں قرآن کی بے حرمتی مذکور تھی۔ 1984ء میں ترمیم کے ذریعے براہ راست احمدیہ کمیونٹی کو مخاطب کیا گیا اور انہیں اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے یا اپنے عقیدہ پر عمل کرنے اور اس کی تشہیر کو جرم قرار دیا گیا۔ اپریل 1984ء میں ضیا الحق نے 298- بی اور 298- سی میں آرڈیننس کے ذریعے احمدیوں کے اسلام سے مشابہہ کسی بھی طرح کے عمل کرنے کو قابل جرم قرار دیا۔ 1986ء میں کرمنل لا ایمنڈمنٹ ایکٹ 1986ء کے ذریعے دفعہ

295- سی کا اضافہ کیا گیا۔ جس کے تحت نبی کی توہین یا گستاخی سزائے موت یا عمر قید کی حد تک قابل سزا جرم ٹھہرے۔

پچھلے کچھ برسوں میں درجنوں لوگوں کو پاکستان میں توہین رسالت کے قانون کے تحت پابند کیا گیا ہے۔ حقائق سے پتا چلتا ہے کہ اقلیتی فرد کے مذہبی خیالات یا کسی بھی طرح کے نئے خیالات پیش کرنے والے پر یہ جرم لاگو کر دیا جاتا ہے اور انہیں ہراساں کیا جاتا ہے۔ اقلیتی گروہوں کے خلاف مخاصمت کے ساتھ ساتھ زیادہ تر کیسوں میں پتا چلا ہے کہ ذاتی دشمنی' پیشہ وارانہ یا معاشی رقابت یا سیاسی فائدہ اٹھانے ایسے محرکات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس قانون کے تحت بند کئے جانے والے افراد کو بالاخر ان کے مذہبی خیالات کی پاداش میں سزاؤں کا سامنا ہے جو کہ کسی بھی شخص کے حق آزادی فکر و ضمیر اور مذہبی حق کی سراسر خلاف ورزی ہے۔

1991ء میں ہونے والی قانونی تبدیلیوں کے بعد سے 295- سی کے تحت توہین رسالت کی سزا سزائے موت ہے۔ اب تک دو افراد کو سزا سنائی جا چکی ہے اور ان کی اپیلیں التوا میں پڑی ہیں۔ ان کیسوں میں کسی کی سزا پر ابھی عمل نہیں کیا گیا' لیکن توہین رسالت کی زد میں آنے والے کم از کم چار عیسائی افراد وفات پا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کی موت جیل میں پر اسرارانہ حالت میں ہوئی جبکہ تین دوسروں کو حملہ آوروں نے قتل کر دیا۔ انہی قوانین کا شاخسانہ ہے کہ جنونی لوگ اب اپنا حق سمجھتے ہیں کہ خود سے قانون کو ہاتھوں میں لے لیں۔ 5 اپریل 994ء کو منظور مسیح کو لاہور ہائی کورٹ کے نزدیک گولی مار دی گئی جبکہ اس کا 13 سالہ لڑکا اور ایک راہ گیر زخمی ہوئے۔ کچھ ہی دنوں بعد گوجرانوالہ میں ایک ہجوم نے قرآن جلانے کے شبے میں پتھر مار مار کر ایک مسلمان کو عیسائی سمجھ کر مار دیا۔ اسے زندہ جلانے کی کوشش کی گئی اور لاش کو گوجرانوالہ کی گلیوں میں دھکیلا گیا۔ منظور مسیح کے قتل کے بعد قومی اسمبلی میں سپریم کورٹ کے سابق جج اور چیئرمین ہیومن رائٹس کمیشن دراب پٹیل نے اعلان کیا کہ اس قانون میں ترمیم کی جائے کیونکہ اس سے مذہبی جنونیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس پر سپاہ صحابہ کی جانب سے رکن اسمبلی اعظم طارق نے چلا چلا کر انہیں کہا کہ توہین رسالت کرنے والوں کا مقدر منظور مسیح جیسا ہو گا۔

حکومتوں نے اس قسم کی دہشت گردی کو روکنے اور اقلیتوں کے تحفظ جان کے لئے کوئی

ٹھوس اقدامات نہیں اٹھائے۔ تاہم 1993ء میں بے نظیر بھٹو حکومت نے اعلان کیا کہ توہین رسالت کے قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے اس قانون' پینل کوڈ اور کرمنل پروسیجر میں تبدیلی کی جائے گی۔

بے نظیر بھٹو کے پہلے دور (90-1988ء) میں اسلامائزیشن میں مزید کوئی اضافہ نہیں کیا گیا جبکہ نواز شریف (3-1990ء) کی زیر قیادت اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت میں مئی 1991ء کو شریعت ایکٹ 1991ء کا نفاذ کیا گیا اس میں اعلان کیا گیا کہ اسلامی اصولوں کو ملک کا اعلیٰ قانون بنایا جائے گا اور تعلیم اور معیشت کو اسلامائز کیا جائے گا جبکہ اس امر کی یقین دہانی کی جائے گی کہ ایکٹ کی کسی دفعہ سے غیر مسلمانوں کے عائلی قوانین' مذہبی آزادیوں' رسوم' رواجات اور طریقہ حیات پر اثر نہیں ڈالا جائے گا۔

اکتوبر 1993ء کے انتخابات میں سیکولر پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی' اسلامی جماعتوں کو 9 اور مسلم لیگ کو 72 نشستیں حاصل ہوئیں۔ تاہم اسی دوران اقلیتی گروہوں پر مذہبی بنیادوں پر ہونے والے حملوں میں اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر 1993ء کے اواخر اور 1994ء کے شروع مہینوں میں جماعت احمدیہ کے اراکین پر کم از کم 13 حملے کئے گئے۔ غیر سرکاری ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق 1987ء اور 1992ء کے درمیانی عرصہ میں 106 احمدیوں پر 298 بی اور 298 سی کے تحت اس وجہ سے مقدمے چلائے گئے اور سزائیں دی گئیں کہ وہ اپنے عقیدہ پر عمل یا تبلیغ اس بنیاد پر کر رہے تھے۔ کراچی کے آرچ بشپ نے اپریل 1994ء میں کہا کہ اس عرصہ کے دوران تقریباً 25 عیسائیوں پر توہین رسالت کے مقدمے بنائے گئے۔

توہین رسالت کے قانون کی آڑ میں آخری بار خون ریزی 1997ء کے شروع میں عیسائی آبادی پر مشتمل ایک گاؤں شانتی نگر میں ہوئی۔ مدرسوں میں پڑھنے والے منظم طالبان نے پورے گاؤں کو آگ لگا کر راکھ کر دیا۔

فرقہ وارانہ یا ذاتی دشمنی کی بنا پر توہین رسالت کے الزامات مسلمانوں کی جانب سے دوسرے مسلمانوں پر بھی لگائے گئے ہیں۔ شیعہ اور سینوں کے مابین فرقہ وارانہ فسادات معمول بن چکے ہیں۔ منظم لوگ منصوبہ بندی کے تحت مخالف فرقہ کو جسمانی ایذا' حملے یا گھروں' عوامی

جگہوں اور عبادت گاہوں میں قتل کر رہے ہیں۔ مذہب کے نام پر بے انتہا غیر رواداری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے جس کی کوئی مذہب بھی اجازت نہیں دیتا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام پر تو صدیوں سے عمل ہو رہا ہے لیکن ایسے قوانین پیش کرنے کی ضرورت کبھی سامنے نہیں آئی۔ حالانکہ آزادی سے پہلے مسلمانوں کو ایک بڑی غیر مسلم آبادی کا سامنا تھا' اگر اس وقت یہ قوانین نہیں بنائے گئے تو اب پاکستان بننے کے بعد نسبتاً کم تعداد میں موجود اقلیتیں کس طرح سے مسلمانوں کی اسلامیت کو زک پہنچا سکتی ہیں۔ آج تک' بالخصوص توہین رسالت کا قانون بننے تک غیر مسلمانوں کی جانب سے قرآن جلانے کا کوئی واقعہ کبھی نہیں سنا گیا تھا۔

ماحصل

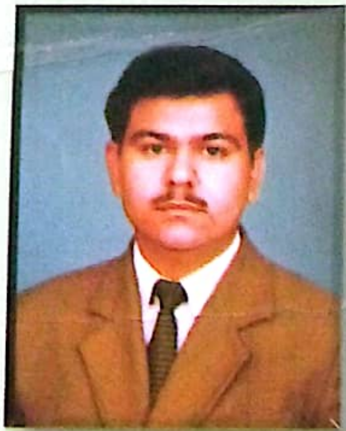
اگرچہ کوئی نئی قومی ریاست تخلیق کرنا ایک کٹھن امر ہوتا ہے لیکن پچھلے پچاس برسوں میں ہمارے ہاں بہت سے مواقع ضائع کیے گئے۔ ہمیں توقع تھی کہ مقننہ' عدلیہ اور سیاسی مشینری پر فائز لوگ سیاسی و سماجی شعبوں میں ترقی کے نقطۂ نظر سے حکمت عملی اور پالیسیاں وضع کریں گے لیکن عملاً اس کے برعکس ہوا۔ غربت' بے روزگاری' نیم روزگاری کا دور دورہ ہے اور سماج کی ہم آہنگی بکھر چکی ہے' 30 فیصد سے زائد لوگ غربت کی حدوں سے بھی نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں جبکہ کل آبادی کا تقریباً 12 سے 15 فیصد حصہ بے روزگار ہے یا نیم روزگاری کا شکار ہے۔

نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔ مذہبی جنونی' طاقت اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں یہ انتشار' ریاستی غیر ذمہ داری' انسانی فلاح میں عدم دلچسپی' برے قوانین کے نفاذ اور بری حکمرانی کا نتیجہ ہیں۔ سپاہ صحابہ اور طالبان خود سے اسلام کے محافظ بن بیٹھے ہیں مزید طرفہ یہ کہ یہ لوگ فوجی طور پر تربیت یافتہ ہیں اور ان کی تربیت یہیں پاکستان میں ہوئی ہے۔

ان تمام حالات کا بدترین شکار مذہبی اقلیتیں اور خواتین ہیں۔ وہ ان قوانین کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں جو خود حکومت نے وضع کیے ہیں۔ ایسے میں پچاس برس پہلے کے نصب العین کے حوالے سے کئی جائز سوال ابھر رہے ہیں۔ کیا ہم نے اپنا مقصد پورا کر لیا ہے؟

آج پاکستان ان قوتوں کے ہاتھوں میں ہے جو ملک میں جمہوریت کی اجازت نہیں دیتے۔ ان قوتوں میں پاکستان میں موجود ضرورت سے زائد طاقتور فوج' بیوروکریٹک گروہ' ملک کے ثانوی سرمایہ دارانہ پیداواری ذرائع اور مذہبی بنیاد پرستی شامل ہیں۔

بنیاد پرستی کے ماحول میں نسلی فسادات' خواتین پر مظالم اور جمہوریت و سماجی انصاف سے انحراف میں اضافہ ہوا ہے۔ قصہ مختصر پاکستان میں ریاست کا کردار بدلنا ضروری ہے۔



Tanveer Ahmad Meer is a human rights activist and a revolutionary writer. He is well known because of his contribution for the protection of human rights of minorities. He is the president of PEACE PAKISTAN *(Writers Wing)*, a pressure group for human rights, social stability and environmental protection. Presently he is working as Publication Secretary in an NGO.
He is a commerce graduate from Punjab University and doing Masters degree in Business Administration.



Murtaza Ali Shah is a human rights & political activist and freelance writer. He has deeply researched about the situation of human rights in Pakistan. He is the Secretary General of PEACE PAKISTAN *(Writers Wing)*. He is also Central Joint Secretary of United Kashmir Peoples National Party.
He did his masters degree in English literature from Punjab University and working as human rights activist since 1991.

Pakistan kay mazhabi achoot

By: Tanveer Ahmad Meer / Murtaza Ali Shah

It's a daring act on part of the two authors to come out and speak for the Pakistani *Ahmadiyya* community that has been suppressed under discriminatory and inhuman laws. Their being is threatened by extremist religious groups, and the general social milieu victimises *Ahmadis* both as human beings and the citizens of Pakistan.

Meer and Shah believe in the spirit of reason and aspire to translate democracy, religious tolerance, peace and human rights into a living reality in Pakistan. They remind the Pakistani state of its international commitments towards fundamental rights and values, and also ask the international community to play its due role in the name of humanity and human rights to save and protect rights of *Ahmadis*. It stands as a stark reality that the minorities, especially the *Ahmadiyya* community are the most oppressed group of human beings in Pakistan who by dint of governmental policies are living a very despicable and discriminatory life and stand at the foot of the social ladder vis-a-vis, rights, education, employment and so on.

Pakistan kay mazhabi achoot goes beyond the ethical dimension of the marginalization of minority communities. It also constructs a Pakistani perspective as to how the early state of the enlightened Quaid -i- Azam slipped itself into the cruel hands of hate-mongers.

.... Essential reading for each concerned and a voice from within to try to enter minority into the mainstream discourse.